نایاب جیلانی

تمہارے ساتھ یہ سفر

"مجھے اس عورت سے نفرت ہے اور اس کے بچوں سے شدید ترین نفرت... اور اب مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔" اس نے سنگی بینچ پر بیٹھتے ہوئے کرب سے سوچا۔

"جب آدمی انسانیت کے مقام سے گرتا ہے تو کیا محسوس کرتا ہے؟ اور جب کسی کی نظر سے گرتا ہے تو کیا بیتتی ہے اس پر؟" کچھ گرم قطرے اس کے گالوں پر پھسلتے ہوئے گردن پر لڑھک آئے تھے۔ اس نے

مکمل ناول

تھک کر بینچ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"وہ خود کو اندھی کھائی میں گرتا محسوس کرتا ہے یا پھر ضمیر کی عدالت میں صفائیاں پیش کی جاتی ہیں۔"

"ضمیر کی عدالت۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

"بڑی سخت عدالت ہوتی ہے۔ جس میں مجرم اپنے لیے خود سزا تجویز کرتا ہے۔ کیا کوئی خود اپنے ہاتھوں گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال سکتا ہے۔" اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسوؤں کو صاف کیا۔ دھند کی وجہ سے کوئی منظر صاف نہیں تھا۔ ہر چیز کہر میں لپٹی اداس تھی بالکل اس کی طرح۔ کچھ ہمت کرکے اس نے اٹھنا چاہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس "بار" کی وجہ سے جو اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے اپنی دھونکنی کی مانند چلتی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے بغیر دیکھے دائیں ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے منرل واٹر کی بوتل کو اٹھایا اور منہ سے لگالیا۔ پھر بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ اور تین چار گولیاں نکال کر نگل لیں۔

"میں نے ساری زندگی کیا کیا۔" اک فلم تھی جو ذہن کی اسکرین پر چلنے لگی۔ آنکھیں بند کرکے اس نے سر جھٹکنا شروع کردیا۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر......

"میں نے صرف اور صرف نفرت کی۔" اس نے سوچا اور پھر اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے کسی سے محبت کی تھی۔ آنکھوں سے ایک بار پھر پانی روانی سے بہنے لگا تھا۔ وہ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے ہنسنے لگی۔ اور پھر ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہو گئی۔

"ہاں میں نے حیدر سے محبت کی ہے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پارک اس وقت سنسان تھا بھلا رات کے دو بجے کسے ضرورت تھی پارک میں آنے کی۔ اس نے دور دور تک سناٹوں کو محسوس کرکے ایک دفعہ پھر اٹھنا چاہا۔ اس بار وہ کامیاب ہو گئی تھی مگر دوسرے ہی پل لڑھکتی ہوئی سرد گھاس پر گر گئی۔ اس کے منہ سے سفید جھاگ نکل رہا تھا جب کہ ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں اور شاید جسم بھی۔

☼ ☼ ☼

نئی صبح نیا ہنگامہ لے آئی تھی اگرچہ اذکی صبح خیز تھی

لیکن نہ جانے کیوں آج آنکھ دیر سے کھلی۔ جب وہ اٹھی تو سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر واش روم کی طرف بھاگی۔ منہ پر دو تین پانی کے چھپاکے مار کر تولیہ سے چہرہ تھپتھپایا۔ دیا اور زید ابھی تک سو رہے تھے۔ اذکی کو کچھ اطمینان ہوا۔ حیدر کا کندھا ہلا کر اسے جگانے اور باتھ روم کی طرف دھکیلنے میں کم از کم سات منٹ لگے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن کی طرف آگئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور فریج کھول کر آٹا نکالنا چاہا تو خالی برتن منہ چڑانے لگا۔ شدید کوفت کے عالم میں اس نے بریڈ کے پیکٹ کو نکال کر ٹوسٹر آن کیا۔ اسی پل حیدر کی حسب معمول آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

"اذکی! میرا ٹاول کدھر ہے؟" وہ باتھ روم میں کھڑا گرج رہا تھا۔ اذکی نے دہل کر دونوں بچوں کی طرف دیکھا۔ پھر تلملاتے ہوئے تولیہ اسٹینڈ پر پھینک کر دیا کو تھپکنے لگی۔ حیدر بالوں کو تولیہ سے رگڑتے ہوئے "جلدی جلدی" کی گردان کیے جا رہا تھا اس کی یہی جلد بازیاں اذکی کو بوکھلا دیتی تھیں۔ ہر کام جو ڈیڑھ منٹ میں ہونا ہوتا تھا الٹ پلٹ ہو کر دس منٹ لے لیتا۔ پھر حیدر کی خفگی عروج پر پہنچ جاتی' پارہ چڑھ جاتا' اور سارا زلزلہ تھر تھر کانپتی اذکی پر گرتا۔ اپنی غلطی کو تو اس نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔

حیدر بلیو شرٹ کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔ اذکی کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے حیدر کے تاثرات نوٹ کیے۔

"حیدر! ٹائم کم ہے' لیٹ ہو جائیں گے آپ۔ جلدی سے چینج کر کے ناشتا کریں۔" اذکی نے اس کا دھیان شرٹ سے ہٹانا چاہا تھا۔ وقت کا احساس دلاتے ہوئے اسے اچانک چولہے پر رکھی چائے کا خیال آیا۔ وہ کچن کی طرف جانے لگی تھی جب حیدر نے جھنجلاتے ہوئے شرٹ صوفہ پر اچھال دی۔

"کہاں جا رہی ہو' وہ وائٹ لائننگ والی شرٹ پریس کرو۔ تم جانتی تو ہو کہ مجھے یہ کلر سخت ناپسند ہے۔"

"آج یہی پہن لیں۔ رات کو میں نے آدھی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ آپ کے کپڑے استری کیے تھے اور ابھی تو میں نے ناشتا بھی بنانا ہے۔" اذکی نے کچھ ڈرتے ہوئے کہا تھا جواباً" حیدر نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ ٹیبل کو ٹھوکر ماری' شرٹ کو اٹھایا اور استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"انتہائی ضدی شخص ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور پھر ناشتا میز پر لگانے لگی۔ پندرہ منٹ بعد فل تیاریوں کے ساتھ خوشبوئیں بکھیرتا وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ اذکی پر نظر پڑی تو ایک اور خطرناک قسم کی گھوری پھینکی۔

"ناشتا تو کرلیں۔"

حیدر کو دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

"نہیں کرنا مجھے ناشتا واشتا۔" اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اذکی نے روکنے کی کوشش کی مگر بے سود وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر کئی سورتیں حیدر پر پڑھ کر پھونکیں۔ جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی وہ کھڑکی میں سے اسے دیکھتی رہی۔ گاڑی نے ٹرن لیا تو وہ پردے برابر کر کے بیڈ روم میں چلی آئی۔

یہ سب تو معمول کا حصہ بن گیا تھا جب کبھی حیدر کا موڈ آف ہوتا وہ اس کے جذبات کا خیال کیے بغیر اپنی ضد پر اڑ جاتا۔ غصے میں کبھی اسے احساس نہیں ہوتا تھا کہ اذکی کے نازک دل کو کتنی ٹھیس پہنچی ہے۔ اب تک تو اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ اپنی فطرت کا کیا کرتی۔ لوازمات سے سجی ٹیبل کو دیکھ کر اسے رونا آگیا۔ مینگو شیک کو فریج میں رکھتے ہوئے اس نے کتنے ہی آنسو بہا دیے۔ ہاف فرائی ایگ' بریڈ' جیم' مارجرین اور کیک' ایک ایک کر کے ساری چیزیں اٹھاتے ہوئے وہ سخت دلبرداشتہ تھی۔ حیدر زیادہ چائے نہیں پیتا تھا جب کہ اذکی کی آنکھیں چائے کے بغیر کھلتی نہیں تھیں لیکن اس وقت چائے پینے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ بچوں کو دیکھا تو وہ ابھی تک سوئے

ہوئے تھے۔ دونوں اڑھائی سال کے ہو رہے تھے بے حد صحت مند اور خوبصورت' اس نے باری باری دونوں کی پیشانی چومی اور پھر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔

دل بھر بھر کے آرہا تھا۔ وہ جتنی بھی کوشش کرتی تھی صبح کے وقت ضرور کوئی نہ کوئی بدمزگی ہو ہی جاتی۔ جب سے وہ اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے تھے حیدر اکثر ہی کسی نہ کسی بہانے سے ناشتا نہیں کرتا تھا پہلے تو صرف شک تھا اسے' اب یقین ہونے لگا تھا کہ حیدر راحت ولا جاتا ہے۔ اسے حیدر کے راحت ولا جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ تو اس کے کٹھور رویے اور بے حسی پر کڑھتی رہتی تھی۔ یہ تو معمول کی باتیں تھیں اس کے لیے۔ صبح صبح حیدر یونہی ہنگامہ مچائے رکھتا تھا اذکی کا ایک پیر کچن میں اور دوسرا بیڈ روم میں ہوتا۔

"اذکی! میرا والٹ نہیں مل رہا۔" وہ دوڑتی ہوئی بیڈ روم میں آتی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے والٹ کو دیکھ کر اسے بھی غصہ آجاتا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اس کے سامنے والٹ لہراتی تو وہ انجان بن کر بھولپن سے بولتا۔

"اچھا ادھر رکھا تھا مجھے تو نظر نہیں آیا۔" یا پھر "میری بلیو ربن والی فائل نہیں مل رہی۔" وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر فائل برآمد کرتی۔

"ذرا موبائل تو چارجنگ پر لگانا۔" وہ فرائنگ پین میں انڈا الٹنا بھول کر موبائل کو دیکھنے لگتی۔ گھی گرم ہو کر اچھلنے لگتا۔ وہ چائے بنا رہی ہوتی تو حیدر ایک دفعہ پھر چیختا ہوا اس کے سر پر پہنچ جاتا تھا۔

"میرے سوکس تو ڈھونڈ دو نہ جانے ایک کہاں غائب ہو گیا ہے۔" وہ سوکس دینے آتی تو نیا آرڈر جاری ہو جاتا۔

"یہ بلیک شوز رہنے دو' براؤن پالش کرو۔" اذکی جوتے پالش کرنا شروع کرتی تو حیدر تیار ہو کر ٹیبل تک آجاتا۔ اسی اثنا میں ناشتا ادھورا رہ جاتا تھا۔ نتیجتاً" وہ جلتا کلستا اسے باتیں سناتا آفس سدھارتا۔ اس سارے قصے میں اپنا قصور نہ ہونے کے باوجود وہ خود کو کوستی رہ جاتی تھی۔ اس وقت بھی اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ دیا کے رونے کی آواز سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ دونوں بہن بھائی نہ صرف اٹھ چکے تھے بلکہ رونے کا پروگرام بھی شروع ہو چکا تھا۔ دیا اور زید کے منہ دھلا کر اس نے باری باری کپڑے تبدیل کیے۔ بیڈ روم کی چیزیں سمیٹیں۔ ان دونوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ناشتا کرواتے ہوئے اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ دونوں تھے بھی بلا کے شرارتی' کوئی ڈیکوریشن پیس ان دونوں کے عتاب سے نہیں بچا تھا۔ وہ تو سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ ان کی تیسری سالگرہ کے بعد مونٹیسوری میں داخل کروا دے گی۔

"آرام سے کارٹون دیکھو' اور خبردار جو شرارت کی تو۔ اور دیا آپ بھائی سے ذرا دور ہو کر بیٹھیں۔" کارٹون لگا کر اس نے دونوں کو ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ باؤلز میں تھوڑے تھوڑے چپس ڈال کر اس نے دیا اور زید کے سامنے رکھے تھے تاکہ دونوں مصروف رہیں۔ دیا نے شرارت سے بھائی کے باؤل میں ہاتھ مارا تھا یعنی کہ حد ہی ہو گئی۔ ذرا بھی تنبیہہ کا اثر نہیں ہوا تھا۔ اذکی کے گھورنے کا الٹا اثر ہوا وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور پھر دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

یقیناً" لاڈ کا موڈ ہو رہا تھا اذکی نے اٹھا کر اس کے گال کو

چوما پھر صوفہ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

"مجھے کام کرلینے دو' پھر پپا آجائیں گے اور میں نے کھانا بھی بنانا ہے۔"

"پپا کدل (کدھر) ہیں۔"

"آفس....." اذکی کی بجائے زید نے مدبرانہ انداز میں جواب دیا اذکی کو ہنسی آگئی۔ وہ دونوں کارٹونز دیکھنے میں محو ہوگئے تھے لہٰذا وہ آرام سے کام کرسکتی تھی۔ حیدر کے کئی مرتبہ کہنے کے باوجود اس نے کام والی نہیں رکھی تھی۔ کام تھا بھی کتنا' سارا دن بور ہونے سے بہتر تھا کہ وہ مصروف ہی رہتی۔ برتن دھونے کے بعد اس نے کچن صاف کیا۔ بچوں کے کپڑے سرف میں بھگوئے تھے انہیں کھنگال کر الگنی پر پھیلایا۔ ڈسٹنگ کی' حیدر کو ڈسٹ سے سخت الرجی تھی حیدر کی امی بھی بے حد صفائی پسند خاتون تھیں۔ مجال ہے جو گرد کی تہہ نظر آجائے' حتیٰ کہ ڈسٹ بن تک چم چم کرتا تھا۔ کام سے فراغت کے بعد اس نے اپنا حلیہ درست کیا۔ دیا اور زید کی آواز نہیں آرہی تھی جب کہ ٹی وی چل رہا تھا۔ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں لاؤنج میں آئی تو دیا صوفہ پر جب کہ زید کارپٹ پر بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے نرمی سے زید کو بانہوں میں اٹھا کر بیڈ پہ لٹایا اور دیا کے اوپر چادر ڈال کرٹی وی بند کردیا۔ اور خود بھی کارپٹ پر دراز ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ذہن راحت ولا میں اٹکا ہوا تھا۔



اذکی نے بریانی دم پر رکھی ہی تھی کہ ڈور بیل گنگنا اٹھی۔ اس نے آنچ دھیمی کرکے باہر جھانکا۔ اس سے پہلے ہی دونوں بچے اچھلتے ہوئے۔ "پپا آگئے" کا نعرہ بلند کیے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

"مما! آبھی جائیں' پپا آگئے ہیں۔" زید نے بے صبری سے اذکی کو پکارا۔ وہ ہاتھ پونچھتی ہوئی ان کے پیچھے آگئی۔ لاک کھول کر وہ ہٹ گئی تھی۔ دونوں بچے باپ سے لپٹ گئے وہ بھی ساری تھکن بھلا کر ان دونوں کو چٹاچٹ چوم رہا تھا۔

"مما کہاں ہیں؟" حیدر نے زید سے دریافت کیا۔

"کچن میں۔"

"اچھا..." اس کا "اچھا" خاصا طویل تھا۔ اذکی نے کچکچا کر حیدر کو دیکھا۔ وہ زید اور دیا کو ایک ایک چاکلیٹ کھول کر پکڑا رہا تھا۔ کچن کے دروازے کے پاس وہ لحہ کو رکا پھر بڑے انداز میں گنگناتے ہوئے بیڈ روم میں چل دیا وہ نہا کر باہر نکلا تو اذکی بیڈ روم میں موجود تھی۔

"آج آپ دیر سے کیوں آئے ہیں۔" اس کے تھانیدارانہ انداز پر حیدر نے مسکراہٹ ضبط کی۔

"دراصل ایک دوست کو اس کے گھر ڈراپ کرنا تھا۔ اس کا راستہ چونکہ دوسرا تھا اسی لیے دیر ہوگئی۔" خلاف توقع حیدر نے ذرا تفصیل سے جواب دیا۔

"جن کے راستے مختلف ہوں ان دوستوں کو ابتدا میں ہی اللہ حافظ کہہ دینا چاہیے۔ اس سے نہ صرف اپنا وقت بچتا ہے بلکہ طویل سفر کی تھکان بھی نہیں ہوتی۔"

"کھانا کھلانے کا پروگرام ہے کہ فلسفہ پر ہی ٹرخاؤ گی۔" حیدر مسکرایا' تم کم ہی چہرہ مبارک پر مسکراہٹ جلوہ افروز ہوتی تھی۔ اذکی اس کا موڈ بہتر دیکھ کرپلٹ گئی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر برتن رکھ رہی تھی جب وہ ایک دفعہ پھر بنا ٹھنا سا اس کے قریب چلا آیا۔

"کہیں جانا ہے آپ کو۔" اذکی نے اس کی "تیاریوں" کو دل ہی دل میں سراہا۔ غضب کی ڈریسنگ ہوتی تھی اس کی بلا کا نفاست پسند تھا۔

"ہاں... ایسا ہے کہ تم بچوں کو تیار کردو اور خود بھی ہو جاؤ' میں اتنے میں گاڑی نکالتا ہوں۔ ایک دوست کا نکاح ہے آج "شہنائی" میں۔ مجھے اصل میں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کا ایس ایم ایس آیا ہے۔ اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو' فٹافٹ تیاری پکڑو۔" اذکی نے کچھ جھنجلا کر چمچہ ٹیبل پر پٹخا۔ اس کی اسی طرح کی لاپروائیوں پر اسے جی بھر کے تاؤ آتا تھا۔

"یہ کوئی وقت ہے بتانے کا۔ آپ صبح بھی تو ذکر کرسکتے تھے میں کم از کم بچوں کے کپڑے ہی پریس کردیتی۔"

"کہا تو ہے کہ ذہن سے نکل گیا تھا۔" اذکی نے تیزی سے برتن میز پر سے سمیٹے' دیا نے چاکلیٹ سے منہ اور دونوں ہاتھ گندے کرلیے تھے۔ اس کا منہ اور ہاتھ دھلوا کر کپڑے بدلتے ہوئے وہ مسلسل نیچے سے آنے والے ہارن کی آواز سن کر بھنا رہی تھی بچوں کو تیار کرکے اس نے اپنے کپڑے الماری سے نکالے تب ہی موبائل کی بپ بجنے لگی تھی۔ اذکی نے جھلا کر موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر حیدر کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"دس منٹ تک آرہی ہوں۔" حیدر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ سرعت سے بولی۔

"تم رہنے دو' میں پہلے ہی لیٹ ہوچکا ہوں۔ کم از کم تم آدھا گھنٹہ تو مزید لگاؤ گی۔ لہٰذا دروازہ بند کرکے کھانا کھالو' میں دیر سے آؤں گا۔" اذکی نے گہری سانس خارج کرکے کپڑے بیڈ پر پھینکے اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"مما چلیں بھی۔" دیا نے اس کا بازو ہلایا۔ زید منتظر سا بیٹھا تھا۔ اس نے بکھری ہمتیں سمیٹ کر بچوں کو اٹھایا۔ بالوں میں برش چلا کر پرس پکڑا اور دروازے لاک کرکے سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخر بچوں کو بھی بہلانا تھا۔ حیدر کو اس نے مختصر سی کال کرکے بتادیا تھا اپنے جانے کے متعلق۔



حیدر رات ساڑھے بارہ بجے گھر آیا تھا اس کے ساتھ ساحرہ بھی تھی۔ وہ ساحرہ کی ضد پر ہی اسے یہاں لایا تھا۔ فلیٹ کی سجاوٹ اور خوبصورتی کو ساحرہ نے بڑی حاسدانہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو نظروں میں تول رہی تھی۔ خصوصاً حیدر کے بیڈ روم میں آکر اس کا حسد نفرت میں بدلنے لگا۔ من میں لاوا سا پک رہا تھا جو کہ ابلنے کو بے تاب تھا۔ اس نے زہریلی نگاہوں سے دیا اور زید کی انلارج تصویر کو گھورا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے تھے۔ بیڈ کے عین سامنے والی دیوار پر اذکی کی فل سائز تصویر ٹنگی

تھی، ہنستی مسکراتی۔ ازکی تفخر سے حیدر کے پہلو میں کھڑی تھی۔ حیدر واش روم میں تھا جب باہر آیا تو اسے بت بنا پا کر قدرے حیران ہوا تھا۔

"کیسا لگا تمہیں میرا فلیٹ۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔ ساحرہ نے مڑ کر کٹیلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"صرف تمہارا۔" وہ دھیمی آواز میں غرائی۔ حیدر کو اپنے لفظوں کے چناؤ پر پشیمانی ہوئی۔ اس نے ساحرہ کا بدلتا موڈ بھی دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا نرمی سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کچن میں چلا گیا۔

"اس ڈربے کا راحت ولا سے کیا مقابلہ۔" ساحرہ نے دل کو تسلی دی۔ ٹرے میں کافی کے مگ رکھے حیدر کمرے میں آیا تو ساحرہ پہلے جیسی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی محسوس کر کے سیدھی ہو گئی۔

"یہ کافی پیو۔" ساحرہ نے مگ حیدر کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ کافی پیتے ہوئے بھی وہ مسلسل حیدر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے ساحرہ کی نظروں سے اب الجھن سی ہونے لگی تھی۔ تاہم اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"اچھی بنی ہے نا کافی۔" حیدر نے ساحرہ سے تائید چاہی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جانتے ہو کتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد تمہارے ہاتھ کی بنی کافی پی ہے۔" ساحرہ کا لہجہ عجیب سا تھا یا پھر حیدر کو ہی لگا۔ کئی لمحے وہ کچھ بول نہیں سکا تھا۔

"اصل میں مصروفیت ہی اتنی ہے کہ......"

"تمہاری مصروفیت کا دائرہ ازکی اور ان دو بچوں تک محدود ہو گیا ہے حیدر!" وہ پھنکاری۔

"تمہارے پاس میرے لیے کوئی لمحہ کوئی وقت نہیں ہے۔"

"تم ایسا نہیں کہہ سکتیں۔" حیدر اس کے لہجہ کی تیزی محسوس کر کے نرمی سے بولا۔

"میں صبح ناشتا تمہارے ساتھ کرتا ہوں، لنچ بھی راحت ولا میں کرتا ہوں۔ چاہے کتنا ضروری کام کیوں نہ ہو، چھوڑ چھاڑ کر صرف تمہاری خاطر بھاگا آتا ہوں۔ آفس ٹائم کے بعد پہلے تمہارا درشن کرتا ہوں، ادھر تو بعد میں آتا ہوں میں اور تم جانتی بھی ہو کہ ازکی اور بچے بالکل اکیلے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود میں رات صرف اور صرف تمہارے لیے راحت ولا میں گزارتا ہوں تاکہ تم تنہائی محسوس نہ کرو۔" حیدر نے بے حد رسانیت سے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔ ساحرہ کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ یہ خوبصورت فلیٹ اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ نفرت سے سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"تمہاری محبت نجانے کہاں سوئی ہے۔ تم بدلتے جا رہے ہو حیدر....." ساحرہ نے مگ ٹیبل پر پٹخا۔ تھوڑی سی کافی چھلک کر میز کی شفاف سطح پر بکھر گئی تھی۔

"یہ بچے تمہارے لیے اہم ہوتے جا رہے ہیں۔" ساحرہ نے دیا اور زید کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"تم مجھے بھول رہے ہو، چند سالوں بعد تمہیں ساحرہ یاد بھی نہیں رہے گی۔"

"ساحرہ! تم نے بدگمانیوں کی بہت بڑی فصیل کھینچ لی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں، میں کل بھی تمہیں چاہتا تھا، آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ تو مجھے کہنا چاہیے کہ تم بدل رہی ہو۔ کہاں گئی میری وہ دوست جو بن کہے میری ساری پریشانیاں جان جاتی تھی جسے کچھ بتانے کے لیے مجھے لفظوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا تھا جو میرے چہرے کو پڑھنے کے فن سے آشنا تھی اور جسے پا کر میرے وجود کی تکمیل ہوتی تھی جو میرے دل کے موسموں، مزاج کے رنگوں اور میری عادتوں سے واقف تھی۔"

حیدر کو حقیقتاً ساحرہ کی سوچ سے دکھ ہوا تھا، وہ دلفریب رسیلی آواز والی ساحرہ نجانے کہاں کھو گئی تھی جو لفظوں کی جادوگر تھی۔ اس وقت تو وہ ایک عورت نظر آ رہی تھی۔ حسد و رشک کی کیفیت میں مبتلا عام سی عورت۔ ساحرہ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط بول رہی ہے۔ اس نے اپنی پسند سے بساط بچھائی تھی اور مرضی کے مطابق مہرے رکھے تھے۔ ہر بازی سوچ بچار سے جیتی تھی۔ جیسا کہ حیدر اس کا تھا۔ حیدر کی ماں، بہنیں اور خاندان والے سب گن گاتے تھے اس کے۔ اس نے ساری فضول سوچوں کو جھٹک کر حیدر پر توجہ دینی شروع کی تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بہت بڑی بے وقوفی کرنے چلی تھی۔ اس سے شکوہ شکایات اور لڑائی جھگڑا کر کے۔ ساحرہ نے بڑی مہارت سے موضوع بدل دیا تھا۔ اب وہ امی جی کی بیماری اور ثمرہ کے سسرال میں ہونے والے تازہ ترین فنکشن کو ڈسکس کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ حیدر کا دھیان بٹ گیا تھا۔ آج وہ ازکی کے گھر میں تھی اس کے بیڈ روم میں۔ ایک دفعہ پھر وہ دانستہ ازکی کو ہرانے والی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سوچ کی پرچھائیں تھی جب کہ دل قدرے مطمئن ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ اس نے بڑے استحقاق سے مگ اٹھا کر کچن میں رکھے۔

"کل جب وہ آئے گی اور اسے میرے یہاں آنے کا پتا چلے گا پھر کیسی کیفیت ہو گی اس کی۔" پورے گھر کا جائزہ لے کر ساحرہ نے تنفر سے سوچا اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔



ازکی اگلی صبح دن چڑھے ہی آ گئی تھی۔ مامی جی نے تو بہت روکا تھا مگر وہ حیدر کی پریشانی کے خیال سے جلد آ گئی۔ کچھ بچے بھی وہاں مطمئن نہیں تھے۔ جواد بھائی کے شریر بچوں نے دونوں کو اچھا خاصا بے زار کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ صبح ہوتے ہی نکل پڑی۔ جواد بھائی اسے چھوڑ گئے تھے۔ گھر کی الٹ پلٹ حالت اور سنک میں برتنوں کے ڈھیر کو دیکھ کر اسے رات مامی جی کی طرف رکنے پر بے حد افسوس ہوا۔ بچوں کو کھلونے دے کر اس نے کمر کس لی تھی۔ ابتدا کچن سے کی، برتن دھوئے، شیلف اور کیبنٹ وغیرہ صاف کیے، خوب رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ لاؤنج میں، بکھرے کشن ترتیب سے رکھے۔ بیڈ روم میں آ کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ حیدر کے کپڑے، کتابیں وغیرہ کارپٹ پر بکھری ہوئی تھیں تولیہ ٹوائلٹ کے دروازے کے عین وسط میں پڑا نوحہ کناں تھا، کشن زمین بوس تھے، گندے چائے کے کپ اور دودھ کے گلاس میز پر اوندھے پڑے تھے۔ بیڈ شیٹ لٹک رہی تھی۔

"کمال ہے حیدر نے ایک رات میں ہی اتنا "کھلارا" ڈال دیا ہے۔" چیزیں سمیٹتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ تکیے درست کرتے ہوئے کوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی تھی۔ کئی لمحے وہ اسے ہاتھ میں پکڑے گھورتی رہی۔ اس کے دل کی رفتار یکدم ہی بڑھ گئی تھی۔ گولڈ کا دل والا لاکٹ اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ کس کا ہے۔

"تو کیا وہ یہاں آئی تھی۔" ازکی کا تنفس تیز تیز چلنے لگا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتی چلی گئی۔ آنکھوں میں امڈنے والی نمی کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اپنی ہستی کی نفی اور ناقدری پر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ تہی دامنی کا احساس کچوکے لگانے لگا۔

"مجھے کیا ملا ہے۔" روتے روتے اس نے اچانک سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دونوں بچے سہمے ہوئے دروازے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ازکی نے تڑپ کر انہیں اپنی بانہوں میں لے لیا۔ دیا اور زید بھی اس کے ساتھ مل کر رو رہے تھے۔

"میرا سب کچھ تو یہی ہیں۔ میں خالی دامن کب ہوں بھلا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی امیر ہے۔ میرے دوست میرے بچے ہیں۔" دیا کی پیشانی چومتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔



"آپ اسے یہاں لائے تھے؟" رات کو حیدر نو بجے گھر آیا تھا۔ آتے ہی اس تفتیش پر چڑ سا گیا۔

"میں جسے چاہوں اور جب چاہوں یہاں لے کر آؤں تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی.... یہ میرا گھر ہے، مجھ

سے تعلق رکھنے والا ہر شخص یہاں آئے گا' چاہے وہ کوئی بھی ہو۔" حیدر نے ایک ایک لفظ چبا کر بولتے ہوئے اس کے سوجے پپوٹوں اور گلابی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جب کہ چہرہ بے حد سرخ تھا۔

"میں اس گھر کے مالک کی بیوی ہوں' حق رکھتی ہوں پوچھنے کا۔" اذکی بھاری آواز میں بمشکل بولی۔ حلق میں گولا اٹکنے لگا تھا۔

"میرے خیال میں جو یہاں آئی تھی اس کے پاس بھی ایسا حق محفوظ ہے۔" حیدر کا اطمینان قابل دید تھا۔ اذکی کو اپنا آپ انگاروں سے جلتا محسوس ہوا۔

"یہ میرا گھر ہے' میں اس عورت کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔"

"اپنی زبان کو لگام دو۔" حیدر نے شدید طیش کے عالم میں اس کے رخسار پر تھپڑ دے مارا۔

"کبھی بھی ساحرہ کے متعلق کچھ مت کہنا۔ ورنہ میرے مزاج سے تم واقف ہی ہو۔" اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس نے گرج کر کہا تھا۔

"کیا کرلیں گے آپ' زیادہ سے زیادہ ماریں گے نا' جتنا چاہیں مار لیں لیکن میں ساحرہ کو یہاں آنے نہیں دوں گی۔" نجانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی اس میں۔ حیدر کے ہاتھوں کی رفتار میں مزید تیزی آگئی' اس نے اذکی کو دھکا دے کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ درد سے پھٹتے سر کو انگلیوں سے دباتے ہوئے وہ روئے جا رہی تھی۔ حیدر نے سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی' آخری غصیلی نگاہ اس کے تڑپتے وجود پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

دروازے کی چرچراہٹ سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ پہلے تو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ حواس ٹھکانے آئے تو نئے سرے سے سب کچھ یاد آنے لگا۔ حیدر نے بیڈ روم کی لائٹ آن کر کے شرٹ اتاری' اذکی دیا اور زید کے لیے دودھ کی بوتلیں لینے چلی گئی۔ چار بجے وہ اٹھ جاتے تھے۔ حیدر کپڑے بدل کر آیا تو اذکی لیٹ چکی تھی۔ اس نے اپنا تکیہ اٹھایا اور پھر کارپٹ پر دراز ہو گیا۔

صبح وہ معمول کے مطابق شور مچاتے ہوئے تیار ہو رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بہت دن بعد اس نے ڈٹ کر ناشتا بھی کیا اور پھر بچوں کو باہر لے جانے کا وعدہ کر کے آفس چلا گیا تھا۔ اذکی معمول کے کام نبٹا کر بچوں کو نہلانے لگی تھی۔ جب فون کی بیل گنگنا اٹھی۔ اس نے جلدی جلدی دیا کے اوپر پانی ڈال کر تولیہ لپیٹا اور فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔ دوسری طرف راحت بیگم کی آواز سن کر وہ گڑبڑا گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ کبھی یہاں فون کریں گی۔ بڑا طنطنہ تھا ان میں۔ اس نے سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بس حیدر کا پوچھ کر فون رکھ دیا تھا۔

وہ سوچتے ہوئے الجھن کا شکار ہو گئی۔

لنچ ٹائم میں حیدر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس وقت اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر اذکی کو شدید حیرت ہوئی۔ وہ خوب لدا پھندا تھا شاید کل کے رویے کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ اذکی کو مختلف شاپرز پکڑا کر وہ بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس نے پلیٹیں نکال کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھیں۔ وہ دونوں بچوں کو اٹھا کر لے آیا تھا۔

"انہیں کیوں لائے ہیں' سونے دیتے۔" اذکی دیا کی بے زار صورت دیکھ کر بولی۔ ابھی اس کا سائرن بج جانا تھا۔

"یہ جو میں اتنا کچھ لایا ہوں' یہ کون کھائے گا۔" وہ زید کا منہ دھلواتے ہوئے بولا۔ اذکی بغیر کچھ کہے تولیہ لینے چلی گئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں بچے کچی نیند میں اٹھنے کے باوجود روئے نہیں تھے بلکہ خوب چہک رہے تھے۔

"پپا میں جھولے میں بیٹھوں گی۔" وہ دونوں رات کی تفریح کے متعلق پلاننگ کر رہے تھے۔ اذکی کو ہنسی آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ حیدر کے پاس وقت نہیں ہو گا۔ اور پھر راحت ولا جا کر اسے واپسی کا خیال ذرا دیر سے ہی آتا ہے۔ کھانا کھا کر اس نے برتن سمیٹے جبکہ حیدر دونوں بچوں کو لے کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ کچن صاف کر کے جب وہ آئی تو دیا اس کے سینے پر سر رکھے

سو چکی تھی۔ اذکی نے اسے اٹھانا چاہا تو حیدر نے روک دیا۔

"رہنے دو اسے' اور تم کہاں جا رہی ہو ادھر بیٹھو۔" حیدر نے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی تھی وہ خاموشی سے دوسری طرف بیٹھ گئی۔

"خفا ہو۔۔۔؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا۔ اذکی نے بے حد شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا جبکہ وہ اس کی سیاہ آنکھوں میں پھیلی سرخی اور اداسی کو دیکھ کر نگاہ چرا گیا۔

"کیا نہیں ہونا چاہیے؟" اس سوال کا جواب حیدر کے پاس نہیں تھا وہ خاموش رہا یا پھر وہ مزید اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اذکی کے تیور بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ پہلے بھی ان کے درمیان جھگڑا ہوتا تھا' کبھی کبھار غصے میں اس کا ہاتھ بھی اٹھ جاتا' لیکن اذکی نے کبھی بات کو طول نہیں دیا تھا وہ خود ہی اسے منا لیا کرتی تھی۔ راحت ولا میں رہنے والی ڈرپوک سی اذکی جو امی جان کی ذرا سی بات پر تھر تھر کانپنے لگتی تھی سے یکسر مختلف لگ رہی تھی اس وقت' بے حد پر اعتماد سی۔

"حیرت ہے راحت ولا سے یہاں تک اتنے مختصر سے عرصہ میں اذکی میں اتنی زیادہ تبدیلی آگئی ہے اور مجھے علم ہی نہیں ہو سکا۔" وہ بے حد حیرانگی سے سوچ رہا تھا۔ اذکی کو اس معنی خیز خاموشی سے الجھن ہونے لگی' وہ سنبھل کر اس کے پاس سے اٹھی تھی۔ تکیہ درست کرتے ہوئے اس نے حیدر کی آواز سنی۔

"تم یہ چاہ رہی ہو کہ میں ایکسکیوز کروں' اپنے رویے کی معافی طلب کروں تم سے۔" طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے وہ ایک پل کو رکا۔

"اس بھول میں مت رہنا اذکی بیگم تم کبھی بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکو گی جسے عرف عام میں دل کہتے ہیں۔ اس میں کوئی اور پورے کروفر سے جلوہ افروز ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔ اذکی کی آنکھوں میں کرچیاں چبھنے لگیں۔ سینے میں کچھ بہت زور سے ٹوٹا تھا۔

"اس فلیٹ میں تمہیں لے آیا ہوں تو مالک نہ بن بیٹھو۔ اور ہاں ایک غلط فہمی دور کر لو ابھی سے کہ ساحرہ جب چاہے یہاں آسکتی ہے۔ آئندہ اس معاملے میں بحث مت کرنا مجھ سے۔" وہ لفظوں کے تیر برسا کر کروٹ بدل چکا تھا۔ اذکی ایک پل میں ہی عرش سے فرش پر آگری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو ہلکی سی پشیمانی حیدر کے لہجے سے ظاہر ہو رہی تھی وہ اس وقت مفقود ہو چکی تھی۔ اس نے دوبارہ بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ سات مہینے پہلے جب وہ اسے لے کر راحت ولا سے نکلا تھا تو پہلی مرتبہ اذکی کو قدموں کے نیچے زمین ہونے کا احساس ہوا تھا۔ سر پر چھت اگرچہ نہیں تھی مگر سائبان دینے والا ہم قدم تھا۔ اور اس وقت وہ ایک دفعہ پھر کڑی دھوپ میں بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔ اس تپش نے اس کے دل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ایک دفعہ پھر خلا میں معلق ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی جان نے فون کیا تھا جبکہ تم نے مجھے بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔' وجہ پوچھ سکتا ہوں۔ محترمہ اذکی صاحبہ آپ سے۔"

کھیر بناتے ہوئے اذکی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا۔ حیدر آفس سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس کی گاڑی کو بے وقت گیراج میں دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ پردے کی اوٹ میں اس نے حیدر کے سرخ چہرے اور بھینچے ہوئے لبوں کو دیکھا تھا۔ اس کے سیڑھیاں چڑھنے اور کچن تک آنے میں صرف تین منٹ لگے تھے جب کہ اذکی پر ایک ایک پل بھاری ہو گیا تھا وہ جان گئی تھی کہ اس سے انجانے میں غلطی سرزد ہو گئی ہے اور اس کی سزا بے حد کڑی ہو گی۔

"وہ میں۔ کل آپ کو بتانا چاہ رہی تھی۔" وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمہارے لفظوں کے تیروں نے مجھے لہولہان کر دیا تھا۔ کچھ بھی محفوظ نہیں رہا تھا نہ دل نہ دماغ۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں اس پل۔

"تم شروع سے ہی خار کھاتی ہو ان سے۔ امی نے فون کیا تھا کہ ساحرہ کی طبیعت خراب ہے مگر تم نے جان بوجھ کر مجھے نہیں بتایا۔" وہ دہاڑ رہا تھا جب کہ اذکی اس نئے الزام پر تڑپ کر رہ گئی۔

"یہ۔ جھوٹ ہے۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب امی نے فون نہیں کیا تھا۔" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اذکی نے اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور تنفس کی تیزی کو ملاحظہ کیا۔ وہ بے حد اشتعال میں تھا۔ ساحرہ کا معاملہ ہو اور حیدر کو غصہ نہ آئے۔ وہ ساری دنیا سے لاپروا ہو سکتا تھا مگر ساحرہ سے نہیں۔ نجانے کون سی کشش تھی اس عورت میں' یا پھر کوئی اسم پڑھ کر پھونک رکھا تھا ساحرہ نے حیدر پر۔

"تائی جی نے فون کیا تھا مگر....." وہ منمنائی۔

"شٹ اپ.... فضول صفائیاں دے کر وقت برباد نہ کرو میرا۔ ابھی مجھے ساحرہ کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جانا ہے۔ اور ہاں آج میں تمہیں معاف کر رہا ہوں آئندہ ایسی لاپروائی نہ کرنا۔" اذکی کی بات سنے بغیر اس پر احسان کرتا ہوا دروازہ دھماکے سے بند کر کے سیڑھیاں اتر گیا تھا وہ' دیا "پاپا پاپا" کرتی اس کے پیچھے لپکی تھی جب کہ اس نے دیا کی آواز سن کر بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ بند دروازے کو ننھے منے ہاتھوں سے بجاتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اس نے برنر بند کر کے دیا کو اٹھایا اور ساتھ لگا کر تھپکنے لگی۔

موسم چند دنوں سے بے حد خراب تھا اچانک ہی مشرقی جانب سے تیز بگولا اٹھا جس نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تیز آندھی کے ساتھ بادلوں کی گرج چمک دلوں کو سہما رہی تھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ اذکی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر کے بچوں کو لیے بیڈ روم میں آ گئی۔ بچے بے حد خوفزدہ تھے اس نے دونوں کو کمبل اوڑھا کر فون اٹھایا اور نمبر ملانے لگی۔ حیدر نے کال ریسیو کی تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

"آج میں نہیں آؤں گا۔" اذکی اس کی لاپروائی پر چیخ کر رہ گئی۔ دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر اس نے آہستگی سے کہا۔

"حیدر! بچے بے حد خوفزدہ ہیں اور پھر آپ جانتے بھی ہیں کہ میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"میں تم لوگوں کے ساتھ چپک کر بیٹھ جاؤں۔ بہت شوق تھا تمہیں الگ رہنے کا اب بھگتو خود ہی۔" جواباً وہ دھیمے لہجے میں طنزیہ بولا۔ اذکی جان گئی تھی کہ کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔ فون رکھ کر وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ دیا کھسکتے ہوئے اس کے قریب آ گئی تھی۔

"مما! ڈل (ڈر) لگ رہا ہے؟" اپنے منے سے ہاتھ کو اس کے گال پر پھیرتے ہوئے وہ معصومیت سے بولی۔ اذکی نے بے خیالی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھی ڈل (ڈر) لگ رہا ہے اور بھائی کو بھی۔"

"اچھے بچے ڈرتے نہیں ہیں۔ آپ تو بہت بہادر ہو۔" اس نے کچھ چونک کر دیا اور پھر زید کو دیکھا۔ آدھی بند ہوتی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔ اذکی نے ہاتھ بڑھا کر زید کو بھی قریب کر لیا۔ دونوں بچے اس کے دائیں بائیں تھے۔ اس نے خود کو بہت محفوظ تصور کیا۔ تھوڑی دیر پہلے والی بے سکونی اور تکلیف کا اثر زائل ہو گیا تھا۔

"مما! پاپا نہیں آئیں گے۔" زید نے اس کے بازو میں سر گھسایا۔

"نہیں' باہل (باہر) بالش (بارش) ہے پپا بھیگ جائیں گے۔" دیا بڑے پن سے بولی۔ ساتھ میں ماں سے تائید بھی چاہی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"پاپا امبریلا لے کر آ جائیں گے' دادو پاس ہو گی امبریلا۔" زید نے سر اٹھا کر دیا کو دیکھا۔

"اچھا۔ پاپا آ جائیں گے۔" وہ خوش ہو کر چہکی۔

"بٹو فلائی والی امبریلا لے کر' ہیں مماجی...." دیا نے اس کا بازو ہلایا۔ اس نے کچھ جھنجلا کر دیا کو تھپکا۔ "چلو اب کلمہ پڑھو اور سو جاؤ۔"

"میں پاپا سے کلمہ پڑھوں گی۔" دیا سرعت سے بولی۔

"میں بھی۔" زید نے ایک دفعہ پھر سر اٹھا کر کہا۔ اذکی نے دونوں کو ہلکی سی چپت لگا کر ڈانٹا اور پھر کلمہ سننے لگی۔ دونوں ماں کا موڈ دیکھ کر شرافت سے کلمہ سنانے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپریل کی بڑی خوش گوار سی شام تھی۔ جب اچانک ہی راحت بیگم، ساحرہ اور نائلہ آپی چلی آئیں۔ اذکی حیرت سے گم صم رہ گئی۔ بہر حال انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے دونوں بچوں کو دادو کی آمد سے آگاہ کیا۔ وہ کچھ شرماتے گھبراتے اس کا پلو پکڑے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ راحت بیگم نے دونوں کو دیکھ کر نرمی سے پاس بلایا۔ پیشانی سر چوم کر دیا کو گود میں جبکہ زید کو دائیں طرف اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

"پپا ابھی تک آئے نہیں۔" وہ جانتی تھیں کہ حیدر پہلے راحت ولا ہی جاتا ہے پھر کھانا کھا کر یا پھر کبھی کبھار چائے وغیرہ پی کر ہی اس طرف آتا ہے لیکن نجانے کیا بچوں سے کریدنا چاہا تھا انہوں نے۔

"پپا لات (رات) کو آئیں گے۔" دیا نے فوراً جواب دیا۔ وہ راحت بیگم کی کلائی میں پڑے نفیس سے کنگن کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

ساحرہ خاموشی سے صوفہ میں دھنسی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ اگرچہ اس نے فلیٹ پہلے بھی دیکھ رکھا تھا مگر ان دنوں میں مزید تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ ڈرائننگ روم کا فرنیچر، پردے حتیٰ کہ کارپٹ بھی بدلا گیا تھا۔ اس نے بچوں کے چہرے دیکھ کر مزید تکلیف محسوس کی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں آکر دہری اذیت کا شکار ہو جاتی ہے مگر پھر بھی وہ یہاں آئی تھی ایک اور بازی کھیلنے۔ اسے اذکی کا مطمئن چہرہ دیکھ کر رشک آتا تھا۔ یہی اطمینان ساحرہ کے سکون کو ڈانواڈول کر دیتا۔ وہ جان نہیں پائی تھی اب تک کہ کون سی ایسی چیز ہے جو اذکی کو انتہائی مطمئن رکھتی ہے۔ حالانکہ شوہر اور سسرال والوں نے کبھی اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ ان سب کی نظروں میں اس کی حیثیت کسی بے جان کھلونے جتنی تھی۔

اذکی کولڈ ڈرنکس لے آئی تھی۔ راحت نے سہولت سے انکار کر دیا جب کہ ساحرہ نے نزاکت سے گلاس اٹھا لیا تھا۔ نفیس سے گلاس میں مشروب بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ساحرہ نے گلاس ٹیبل کی چمکیلی سطح پر رکھ کے اذکی کو دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح مؤدب سی بیٹھی تھی آخر راحت بیگم کے سامنے کس کی جرأت تھی کہ جم کر بیٹھ سکے۔ چہار سو معنی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بچے بھی چپ تھے۔ اذکی نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"میں حیدر کو فون کرتی ہوں۔"

"آں۔ ہاں تم رہنے دو، حیدر آرہا ہے۔" اذکی کو اٹھتے دیکھ کر ساحرہ سرعت سے بولی، ساتھ میں جتانے والی معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا اسے۔ وہ جزبز سی بیٹھ گئی کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی، بچے قلانچیں بھرتے ہوئے حیدر کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ اس نے بھی دونوں کو والہانہ انداز میں لپٹا لیا۔ ساحرہ نے محبت کے اس مظاہرے کو دیکھ کر نگاہیں موڑ لیں۔

"پپا آپ لات کو کیوں نہیں آئے، مجھے نیند بھی نہیں آئی آپ کے بغیل (بغیر)...." شکایتوں کی پٹاری کھل چکی تھی۔

"مجھے بھی۔" زید نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔ دونوں کے تابڑ توڑ سوالوں پر وہ بوکھلا گیا تھا۔

"ارے یار سانس تو لینے دو۔" اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے بریف کیس اور کوٹ صوفے پر اچھالا ماں کو دیکھ کر اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

"میں لیٹ تو نہیں ہوا۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اذکی پانی لینے کچن میں چلی گئی تھی۔

"نہیں، ابھی ہمیں آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔" راحت خوش گوار موڈ میں بولیں۔

"پپا! میں آپ کے ساتھ آفس جاؤں گی۔" ساحرہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے جب دیا نے اچانک اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ساحرہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

"وہ کیوں بھئی۔" حیدر نے نشست بدل کر دیا کی طرف دیکھا جو کہ بریف کیس کے بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

"اس لیے کہ بالش (بارش) ہو جاتی ہے۔ پھل (پھر) آپ آفس سے نہیں آتے۔ دادو پاس چلے جاتے ہیں۔"

"اور آپ کیا کرو گی۔" حیدر نے دلچسپی سے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں امبریلا۔"

"دیا اٹھو شاباش نوڈلز کھالو۔" اذکی نے اسے پچکارا۔ زید کو اٹھنے کا اشارہ کر کے وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی تھی۔ دونوں نے بھی منہ بسورتے ہوئے ماں کی پیروی کی۔

"حیدر! مجھے گھر بھی جانا ہے لہٰذا تم بات کرو اذکی سے۔" نائلہ آپی نے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ حیدر کو بھی ان کی آمد کا مقصد یاد آگیا تھا اس نے اذکی کو آواز دے کر بلایا۔

"میں نے تو اس وقت بھی ساحرہ سے کہا تھا یہ خود ہی نہیں مانی تھی۔ چلو اب بھی سہی بھلا ہمیں کیونکر اعتراض ہونا ہے۔" اذکی، راحت بیگم کے الفاظ سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ راحت کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے حیدر کے چند الفاظ سنے تھے۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے فق چہرے کے ساتھ بامشکل کہا۔ ساحرہ کے علاوہ سب نے ہی اسے گھورا تھا۔ ساحرہ اطمینان سے سامنے دیوار پہ ٹنگی پینٹنگ بغور تک رہی تھی۔

"لگتا ہے تمہیں ہماری زبان سمجھ میں نہیں آتی۔" راحت نے ناگواری سے اسے لب کاٹتے دیکھ کر کہا۔ وہ بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوگا۔" بہت مشکل سے یہ چند الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے ورنہ اس سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ راحت کو اس کے کورے جواب نے طیش دلا دیا۔ بھلا اس کی اوقات ہی کیا تھی کہ راحت کے سامنے انکار کرتی۔

"بہت بولنے لگی ہے امی جان یہ، آپ کا بھی لحاظ نہیں رہا۔ اس دو کمروں کے فلیٹ میں آکر نجانے کیا سمجھنے لگی ہے خود کو...." نائلہ آپی کٹیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے امی جان سے مخاطب ہوئیں۔

"حیدر! اس سے کہو کہ دیا کا بیگ تیار کرے۔" راحت نے کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تائی جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں دیا کو کیسے جانے دوں۔ اسے تو میرے بغیر سونے کی عادت بھی نہیں ہے۔" وہ جانتی تھی کہ راحت جو کہتی ہیں وہی کرتی ہیں۔ ان کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ وہ اپنی ضد منوا کر دم لیتی ہیں لہٰذا منت بھرے لہجہ میں کہتے ہوئے گڑگڑائی تھی۔

"دیا غیروں میں نہیں جا رہی ہے، میں اس کی دادی ہوں، ساحرہ بھی ماں ہے۔ اور ویسے بھی یہ ساحرہ کا حق بنتا ہے۔ پہلے وہ اس لیے خاموش رہی تھی کہ دیا کو تمہاری ضرورت تھی لیکن اب وہ ساحرہ کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اگلے سال تک اسکول جانے کے قابل ہو جائے گی۔" انہوں نے دو ٹوک بات کر کے اسے اشارہ کیا۔ اذکی کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اس سے کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ وہ بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"حیدر آپ تائی جی کو سمجھائیں۔" اس نے امید بھری نظروں سے حیدر کے پرسوچ چہرے کی طرف دیکھ کر بھرائی آواز میں کہا۔ راحت کو گویا پتنگے لگ گئے۔

"کیا کہہ رہی ہو لڑکی تم، حیدر مجھے یعنی اپنی ماں کو سمجھائے۔ بہت بول لیا تم نے اب بس، جاؤ حیدر دیا کو لے آؤ نائلہ کو دیر ہو رہی ہے۔ اسے گھر ڈراپ کرنا ہے۔" تائی جی نے چادر سنبھالی۔ ساحرہ اور نائلہ بھی اٹھ چکی تھیں۔ حیدر دیا کو لے آیا تھا۔ اذکی کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچا۔

"حیدر! آپ میری بچی کو نہیں لے جا سکتے۔ میں اس ڈائن کے حوالے اپنی بیٹی نہیں کروں گی۔" وہ چیخی

ہوئی آگے بڑھی تھی، حیدر نے اس کا بازو پکڑ کر صوفے پر پٹخا۔

"یہ ڈرامہ بازی بند کرو۔" وہ غرایا۔ بچی ماں کو روتے دیکھ کر کسمسائی۔ نائلہ نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا تھا۔ اذکی نے دھندلائی نظروں سے ان سب کو جاتے دیکھا۔ اس کے گالوں پر آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے جب کہ شہ رگ پر کسی نے چھری چلادی تھی وہ اذیت سے کراہنے لگی۔ زید ماں کے رونے کی آواز سن کر لاؤنج میں آگیا تھا۔ اسے چیختے دیکھ کر زید نے بھی چلانا شروع کردیا تھا۔ جب وہ رو رو کر تھک گئی تو خود ہی خاموش ہوگئی۔ زید اس کے پیروں میں لیٹا اونگھنے لگا تھا۔ وہ اس کے گلابی گالوں پر سے آنسو چنتے ہوئے اپنی گزشتہ زندگی کو سوچنے لگی اسے لگ رہا تھا کہ زندگی میں اب کوئی خوش نہیں بچی، امید کے جگنو راستہ بھول گئے تھے۔ راہوں میں کوئی روشنی نہیں رہی تھی چہار سو اندھیرا اور تاریک رات پنکھ پھیلائے خوشیوں کو نگلنے کے لیے بے تاب بیٹھے تھے۔



"آپ نے اچھا نہیں کیا عباس صاحب؟" راحت نے دبیز قالین پر ٹہلتے ہوئے تیسری مرتبہ کہا تھا۔ ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی عباس نے فائل سے سر اٹھا کر راحت کے سرخ و سفید چہرے پر غصے کی لالی کو بغور دیکھا۔ اور دوبارہ سے سر جھکا دیا۔ وہ بڑی اہم فائل اسٹڈی کر رہے تھے ان کا ذہن راحت کے ادا کیے۔ ان چار لفظوں میں الجھ کر رہ گیا۔ تنگ آکر انہوں نے فائل بند کی، عینک اتار کر ٹیبل پر رکھی۔ اور اٹھ کر راحت بیگم کے قریب چلے آئے۔ ان کے کندھے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ راحت لب بھینچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا اچھا نہیں کیا میں نے، تشریح کرنا پسند فرمائیں گی آپ۔" وہ نہایت ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔ مگر اس لمحے شدید کوفت و جھنجلاہٹ نے گھیر لیا تھا انہیں۔ راحت نے تیکھے چتونوں کے ساتھ گھورا۔

"سب کچھ کر کے معصوم بن رہے ہیں آپ۔"

"حیدر میری اولاد ہے۔ بیٹا ہے میرا وہ۔ اگر میں نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرلیا ہے تو کون سا گناہ سرزد ہوگیا ہے مجھ سے۔ میں حق رکھتا ہوں اس پر۔" انہوں نے بے حد ضبط سے اپنی شریک حیات کو سمجھانا چاہا تھا۔

"بات حق حقوق کی نہیں اصول کی ہے۔ میں نے شروع سے ہی چند اصول مقرر کیے تھے اور آپ بھی پابند ہیں۔ ان اصولوں کے۔ کیا ایک ماں کے جذبات مجروح نہیں ہوئے؟ اس کے ارمانوں کا گلا نہیں گھونٹا گیا؟ میرے وجود کی نفی نہیں کی گئی۔"

غم و غصہ کی وجہ سے راحت کے ماتھے کی رگ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ غصہ میں ان کا بی پی شوٹ کر جاتا تھا لہٰذا گھر میں سب ہی اس بات کا خصوصی خیال رکھتے تھے کہ کچھ بھی ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو پائے۔

"آپ نے نائلہ کی شادی اپنی پسند سے کی، میں خاموش رہا۔ منیبہ اور ثمرہ کے متعلق آپ کے فیصلے کو اہمیت دی گئی۔ سدرہ کی منگنی بھی آپ نے اپنی مرضی سے کی۔ میں اس وقت بھی نہیں بولا۔ اگرچہ آپ کے فیصلے بہت بہترین تھے۔ اللہ کا شکر ہے میری بیٹیاں اپنے گھروں میں شاد آباد ہیں۔ اگر میں نے بیٹے کا رشتہ اپنی پسند سے کرلیا ہے تو آپ کو فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہیے۔" وہ رسان سے گویا ہوئے۔ راحت نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"کون سا رشتہ، میں نہیں مانتی اس نام نہاد بندھن کو۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا کیا ثابت کرتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔" راحت نے خاکی لفافے کو میز پر اچھالا، عباس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔ اذکی میری بھتیجی ہے اور میرے اکلوتے بیٹے کی منکوحہ، آپ کے انکار کرنے سے نہ اس کی حیثیت بدل سکتی ہے۔ اور نہ ہی اہمیت میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ راحت ولا کی وہ اکلوتی بہو ہے، سن رہی ہیں آپ۔" عباس نے گویا کھلا چیلنج کیا تھا۔ مارے تحیر کے راحت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کی ہر بات پر سر جھکانے والے نے اچانک پینترا بدلا تھا اور وہ بھی اس لڑکی کی خاطر، جس کی کوئی حیثیت سرے سے تھی ہی نہیں۔ وہ اس معمولی لڑکی کی خاطر اپنی بیوی سے جھگڑ رہے تھے۔ راحت کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

"آپ کس انداز میں گفتگو کر رہے ہیں میرے ساتھ۔" کئی لمحے خاموش رہنے کے بعد راحت نے تیز لہجے میں کہا۔ عباس بغیر کچھ کہے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے دانستہ راحت کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور پھر بند ہوا۔ راحت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ عباس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ان سے بلند آواز میں بات کی تھی وہ بھی اس معمولی لڑکی کی وجہ سے۔ جسے وہ کل رات ہی گھر لائے تھے۔ راحت کے سر پر گویا آسمان آن گرا۔ ان کے دل میں چھپی شدید نفرت ابھر کر سامنے آگئی تھی۔ عباس نے جانتے بوجھتے حیدر کا نکاح اس لڑکی کے ساتھ کر کے انہیں گویا سلگتی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ راحت نے چند سال پہلے ہی ان کے کان میں یہ بات انڈیلی تھی کہ وہ حیدر کے لیے لڑکی پسند کرچکی ہیں۔ اس کی تعلیم ختم ہونے کے بعد اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔ ساحرہ ان کی بھانجی تھی بے حد ذہین، خوبصورت اور چنچل سی، حیدر کو بھی وہ پسند تھی۔ دونوں کی بے تحاشا دوستی اور قلبی لگاؤ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کزنز بھی تھے۔ اسٹڈی کے علاوہ بھی خوب گپ شپ رہتی تھی۔

دونوں گھرانوں کی خواتین کے درمیان بات چیت تقریباً طے تھی۔ ساحرہ بھی جانتی تھی کہ عنقریب حیدر سے اس کا گہرا تعلق بننے والا ہے جبکہ حیدر کو بھی راحت نے اول روز سے ساحرہ کے متعلق بتا دیا تھا۔ ساحرہ خود بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے احساس دلادیتی تھی۔

راحت نے ان دونوں کے حوالے سے بے حد خواب بن رکھے تھے۔ خاندان کی چند ایک تقاریب میں انہوں نے دبے دبے لفظوں میں اس "رشتہ" کا اظہار کردیا تھا تاکہ لوگ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ مگر چند ہی لمحوں میں ان کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔ وہ گویا پتھر کا بت بنی حیدر کی پشت کو گھورے جارہی تھیں جو لاپروائی سے بیٹ لہراتا باہر نکل گیا تھا۔

چند دن پہلے عباس کے نام ایک رجسٹری آئی تھی۔ راحت کو اندازہ نہیں تھا کہ اس لفافے میں کیا چھپا ہے۔ جب عباس نے لفافہ وصول کر کے بے تابی سے کھولا اور اس کے اندر سے برآمد ہونے والی تحریر کو پڑھ کر وہ ساکت رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے ملازم کو گاڑی نکالنے کا اشارہ کیا۔ خود تیار ہو کر وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھے۔ راحت کو مختصر لفظوں میں بتا کر انہوں نے بائیک نکالتے حیدر کو آواز دی۔ اس نے چیونگم چباتے ہوئے باپ کی جلد بازی کو نوٹ کیا۔ کھڑکی کے پاس آکر اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ بریف کیس کھولے کچھ تلاش کر رہے تھے۔

"بابا! کہاں جارہے ہیں؟" انہیں مطلوبہ چیز مل گئی تھی۔ بریف کیس کو بند کر کے انہوں نے پچھلی سیٹ پر رکھا پھر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"ذرا میرے ساتھ آؤ۔" بائیک کی چابی اس نے بشیر کی طرف اچھالی اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ بابا عموماً خود ڈرائیو کیا کرتے تھے۔ یہ گاڑی انہیں بے حد محبوب تھی۔ بہت حفاظت سے انہوں نے اسے رکھا ہوا تھا۔ بقول ان کے "بڑی یادیں وابستہ ہیں اس سے" وہ اکثر امی کے ساتھ مل کر ان کی "کھٹارا" کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

جوش میں آکر اور کچھ گاڑی ڈرائیو کرنے کے شوق میں اس نے بابا کی بات مان تو لی تھی مگر جب اس ٹوٹے پھوٹے گندے سے محلے میں داخل ہوئے اور مسلسل جمپ لگنے کی وجہ سے اچھل کود شروع ہوئی تو وہ چند منٹوں میں ہی بے زار ہوگیا۔

"بابا! یہ آپ کہاں چلے آئے ہیں۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کوئی دسویں مرتبہ کہا تب جواباً عباس نے اس کا کندھا نرمی سے تھپتھپایا۔

"بس..... وہ رہا سامنے گھر۔" سبز دروازے کے پاس گاڑی روک کر اس نے کوفت کے عالم میں اس "گھر" کو دیکھا جو کہیں سے بھی گھر نہیں لگ رہا تھا دڑبے کی طرح تنگ اور تاریک سا۔ پھر بابا کو ایک بے حد کمزور بوڑھے شخص سے گلے ملتے دیکھ کر اس کی کوفت دوچند ہو گئی۔ وہ بوڑھا بار بار کھانس رہا تھا۔ تخت پر بیٹھی ادھیڑ عمر عورت اپنے کھچڑی زدہ بالوں کو کھجاتے اٹھی اور گھڑے سے پانی نکال کر لے آئی۔ پانی پی کر سانس قدرے بحال ہوئی تھی اس لاغر سے آدمی کی۔

"شاید بیمار ہے۔" حیدر نے سوچا۔ اس چھوٹے سے مکان میں اتنے افراد کو دیکھ کر اسے بے تحاشا حیرت ہوئی۔ ڈھیروں کے حساب سے بچے، گھر گھر پھرتی خواتین۔ کچھ درمیانی عمر کے مرد ڈیوڑھی میں پڑے اونگھ رہے تھے۔

"یہ مہمان ہیں، رفیق کا پتا لینے آئے ہیں۔" کھچڑی زدہ بالوں والی عورت نے اس کی حیرت کو دور کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد چند اور بوڑھی عورتیں چلی آئیں۔ ان کے پیچھے دھان پان سے وجود والی لڑکی بھی نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ واضح تھی جبکہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے بھی لرز رہی تھی۔ اس نے بدرنگ میز پر ٹرے رکھی۔ بابا نے اٹھ کر والہانہ انداز میں اسے لپٹا لیا تھا حیدر کو ایک دفعہ پھر جھٹکا لگا۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرائے لہجے میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ حیدر کو یہ سین ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ جب تک وہ لڑکی آنسو پونچھتے ہوئے چارپائی پر نہیں بیٹھی تھی وہ پہلو ہی بدلتا رہا۔ بابا اس کا ہاتھ پکڑے نجانے سرگوشی میں کیا کہہ رہے تھے۔ حیدر کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

"ایک تو بابا بولتے بہت ہی آہستہ ہیں۔" کب سے ان کی سرگوشیاں برداشت کر رہا تھا۔ پتا نہیں کون سے ایسے راز و نیاز تھے جو ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

"بابا! کب چلنا ہے۔" اس نے بے زاری سے جماہی لی۔ ایک تو نیند بے حد آ رہی تھی۔ شام کو اس کا میچ تھا اور ابھی اسے تین چار گھنٹے بھرپور نیند بھی لینا تھی مگر بابا اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ تنگ آ کر اس نے ایک دفعہ پھر پکارا۔

"بابا! کس وقت جانا ہے۔"

"چلتے ہیں بیٹے تھوڑا صبر کرو اور....." بابا کے اگلے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ چارپائی پر لیٹے شخص کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ کھانستے کھانستے وہ بے حال ہو گیا۔ بابا نے اٹھ کر اس کا سینہ مسلنا شروع کیا۔ وہ آہستہ آہستہ بابا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ حیدر نے دور سے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں نمی کو تیرتے دیکھا۔ اسے کچھ افسوس ہوا تھا۔

"نہ جانے بے چارے کو کتنی تکلیف ہے۔"

بابا نے اس کا کمزور ہاتھ تھام کر شاید تسلی دی تھی وہ لمحوں میں ہی پرسکون ہو گیا۔ پاس بیٹھی عورت نے بھی بابا سے کچھ کہا تھا۔ بابا پرسوچ نظروں سے حیدر کو دیکھنے لگے پھر اٹھ کر چلے گئے اس نے بھی بابا کی پیروی کی تھی۔ کمرے میں ویسے بھی گھٹن اور حبس تھا۔ برآمدے میں آ کر اس نے طویل سانس کھینچا مگر دوسرے ہی پل اس کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا۔ بابا کیا کہہ رہے تھے۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بابا کے مرجھائے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میری بھتیجی ہے اذکی، تم نکاح کر لو اس سے بیٹا۔ شاید میرے مرے ہوئے بھائی کو سکون آ جائے۔ میں بھی کس قدر لاپروا ہوں۔ ساری زندگی اس کی واحد نشانی کو پوچھا تک نہیں۔ اگر اب بھی پتا نہ چلتا تو میں بے خبری میں ہی مارا جاتا۔ قیامت میں کیسے منہ دکھاتا اپنے بھائی کو" پھر بابا نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ اسے تو بس یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ حیدر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بابا اسے بغیر نکاح کے جانے نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس نے بغیر سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلایا۔ عباس نے اسے سینے میں بھینچ کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ ان کے بیٹے نے لاج رکھ لی تھی اس وقت ان کی، کچھ ہی دیر

میں سب کو خبر ہو گئی۔ مامی جی افتاں و خیزاں کچن میں مصروف اذکی کے سر پر پہنچ گئیں۔ ان کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ تیرہ چودہ سالہ اذکی نے حیرت سے مامی کے جھریوں زدہ چہرے کو دیکھا۔ وہ بہت مسرور لگ رہی تھیں۔

مولوی صاحب کی طرف چھوٹے کو بھیجا گیا۔ آدھے گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد مولوی صاحب کی شکل نظر آئی۔ کچھ ہی دیر میں نکاح کی کارروائی شروع ہوئی۔ مولوی جی نے ابھی دعا کے لیے ہاتھ بھی نہیں اٹھائے تھے کہ حیدر باپ کے کان میں منمنایا۔

"بابا! میرا میچ....." وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے آمین کہا اور حیدر نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

عباس اذکی کو بازو کے گھیرے میں لیے چلے آئے۔ وہ کانپتی لرزتی مامی کے گلے سے لگ کر خوب تڑپ تڑپ کر روئی۔ اس گھر سے نکل کر اسے خوابوں کے محل میں جانا تھا۔ اس کی سہیلیاں حیدر کو دیکھ کر اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ لوگوں کے تبصرے بھی اس تک پہنچ رہے تھے۔

جس ماحول میں اس نے پرورش پائی تھی اور جس قسم کے حالات سے وہ گزر رہی تھی۔

ان سب نے اس کے شعور کو بے حد پختہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار اور سنجیدہ تھی۔ کچھ مامی نے بھی کانوں میں بہت کچھ انڈیلا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نکاح کا کیا مفہوم ہے۔ راحت ولا میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی آنکھوں نے کچھ خواب بن لیے تھے۔ مگر ان کی مسافت بے حد مختصر تھی۔ پلک جھپکنے کے ساتھ ہی سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ خوشنما خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حیدر نے مختصر سا سارا واقعہ ماں کو من و عن کہہ سنایا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ایک واقعہ ہی تھا۔ خود تو وہ کرکٹ کٹ پہن کر بیٹ گھماتا کلب چلا گیا تھا مگر اپنے پیچھے ایک طوفان چھوڑ گیا۔

راحت غم و غصہ کی تصویر بنی چادر میں لپٹی سہمی سی اذکی کو گھورے جا رہی تھیں۔

ان کے دل میں جو اول روز سے گرہ لگی تھی وہ آخر تک نہ کھل سکی۔ انہوں نے کبھی بھی اسے قبول نہیں کیا تھا۔ لحہ بہ لحہ اس کی تذلیل کی، غربت کے طعنے دیے۔ اس کی عزت نفس کو اپنے قدموں تلے روند کر نہ جانے کون سے جذبے کو تسکین پہنچاتی تھیں وہ اور رہا حیدر تو وہ شاید بھول چکا تھا کہ کسی اذکی نامی لڑکی کو اپنے ساتھ ایک بندھن میں باندھ کر لایا ہے۔ راحت کی طرح نائلہ، منیہ اور ثمرہ کے انداز بھی خاصے روکھے قسم کے تھے البتہ سدرہ نہایت محبت سے ملی تھی اس سے۔ تایا جی کے علاوہ کوئی بھی کلام کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں دبکی بیٹھی رہتی۔ زیادہ دل گھبراتا تو کچن میں گھس جاتی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے راحت کے دل کو جیت لے گی۔ انہیں خوش کرنے کے لیے آہستہ آہستہ اذکی نے بہت سی گھریلو ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھا لیں۔

تایا جی نے اسے اسکول داخل کروانا چاہا تو محض راحت کے خوف کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ راحت کو طعنے دینے کے لیے ایک اور موضوع مل جائے۔ بی اے کرنے کے بعد حیدر نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی، ساحرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ساحرہ کے گھر والوں نے حیدر کے نکاح اور اذکی کی راحت ولا آمد پر اچھا خاصا واویلا کیا تھا تاہم راحت کے یقین دلانے اور حیدر کے ازلی لاپروا رویے کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اذکی ساحرہ کے راستے کی رکاوٹ ہرگز نہیں ہے۔

حیدر بے حد کھلنڈری طبیعت کا مالک تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس سے کسی میچورٹی کی توقع کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

عباس کا ارادہ تھا کہ حیدر کی تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد روایتی انداز میں اذکی کی رخصتی کر دی جائے۔ اپنی بیوی کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اسی

لیے وہ شدت سے منتظر تھے اس بابرکت دن کے، جبکہ راحت تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں۔ محض اذکی کو ایذا پہنچانے اور شوہر پر اپنی ضد ثابت کرنے کے لیے وہ روزانہ ہی ساحرہ کو کسی نہ کسی بہانے بلا لیتیں۔ اس کے لاڈ اٹھاتیں۔ وہ نخرے کر کر کے اپنی من پسند چیزوں کی فرمائش کرتی تھی۔ راحت بغیر ماتھے پر بل ڈالے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی ڈش تیار کر کے رکھتیں۔ یہی حال نائلہ آپی اور ثمرہ کا تھا۔ ساحرہ کو خصوصی اہمیت دے کر وہ دانستہ جتایا کرتی تھیں کہ ساحرہ ہی ان کی من پسند بھابھی ہے۔

وہ بھی گرمیوں کی سخت ترین دوپہر تھی۔ پسینہ گویا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اذکی گرمی سے بے حال دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ نائلہ آپی اور منیہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کی آمد کے فوراً بعد ساحرہ کو بھی فون کر کے بلوا لیا گیا۔ وہ سب لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اذکی نے کھانا تیار کر کے برتن ٹیبل پر لگا دیے۔ پھر پسینہ صاف کرتے ہوئے نجمہ کو لاؤنج میں ان سب کو بلانے کے لیے بھیجا۔

حیدر کسی دوست سے ملنے کے لیے صبح سے نکلا ہوا تھا جبکہ تایا جی لنچ کے لیے آفس سے اٹھ آئے تھے۔ وہ تایا جی کے لیے گرما گرم پھلکے اتار رہی تھی جب ساحرہ کچن میں داخل ہوئی۔

"ارے نجمہ کی جگہ تم نے سنبھال لی ہے۔ ویسے اچھا کیا ہے تم نے 'کھایا پیا حرام کرنے سے بہتر ہے کہ ہاتھ پیر ہلا لیے جائیں۔ جہاں سے کھاؤ تھوڑا حق بھی ادا کرو۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" وہ معصومانہ انداز میں کہتے ہوئے اس کی پسینے سے شرابور کمر کو گھورنے لگی۔ اذکی نے آنکھوں میں امڈنے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ میرے تایا جی کا گھر ہے۔"

"اوہو۔" ساحرہ نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تو گویا معدے کے راستے سے گزر کر سب کے دلوں میں جگہ بنانا چاہتی ہو۔" سرخ خوبانی کو نزاکت سے اٹھاتے ہوئے وہ ایک لمحہ کو رکی۔

"یہ تو تمہاری بھول ہی ہے 'خواہ مخواہ نچڑ رہی ہو گرمی سے۔ ان تلوں میں تیل ہرگز نہیں۔ تم خالہ کے دل اور نگاہ میں کبھی نہیں اتر سکتیں۔" ساحرہ نے تمسخر اڑایا اور پھر اونچی ہیل سے ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئی۔ تایا جی آواز دے رہے تھے۔ وہ نم پلکوں کو صاف کرتی ٹیبل تک آ گئی۔

اسے دیکھ کر راحت کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وہ گھبراتی ہوئی تایا جی کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نائلہ آپی اور ساحرہ آپس میں کچھ بات چیت کر رہی تھیں جبکہ منیہ کھانے کی طرف متوجہ تھی۔ تایا جی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈال رہے تھے۔ اذکی کے حلق سے کچھ بھی نہیں اتر رہا تھا۔ راحت کی مسلسل چبھتی نظروں نے اس کی بھوک کو منٹوں میں مٹا دیا۔ وہ بے دلی سے چاولوں کی پلیٹ میں چمچہ چلانے لگی تھی۔ اسی پل گیٹ پر مخصوص ہارن بجا اور حیدر آندھی و طوفان کی طرح داخل ہوا۔ گرمی کی حدت سے اس کی سرخ و سفید رنگت تمتما رہی تھی۔ اس نے زوردار آواز میں سلام جھاڑا اور ٹیبل کا جائزہ لے کر چمچہ پلیٹ پکڑ لی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے حیدر' آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" راحت نے اسے جلدی جلدی پلیٹ میں چاول ڈالتے ٹوکا۔ حیدر نے گلاس اٹھایا اور لبوں سے لگا لیا۔

"کہاں ہے بے ہودگی۔" اس نے سرعت سے دائیں بائیں دیکھ کر "بے ہودگی" کو تلاشنا چاہا۔ راحت نے کڑی نظروں سے اس کی حرکت کو ملاحظہ کیا جبکہ ساحرہ اور نائلہ آپی نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ اذکی ہنوز سر جھکائے چاولوں کو ٹونگ رہی تھی۔

"ایں تم پھر آ گئیں۔" ساحرہ کی سریلی ہنسی کو سن کر حیدر نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ساحرہ کے مسکراتے لب سمٹ گئے۔

"گھر میں کھانا نہیں ملتا تمہیں یا پھر کک چھٹی پر چلا گیا ہے۔" اس نے ساحرہ کو اشتعال دلانے کی کوشش

کی تھی۔ راحت نے اس کا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا اور حیدر کو ایک دفعہ پھر گھورا۔

"خاموشی سے کھانا کھاؤ۔" عباس نے بھی اسے گھرکا۔ وہ شرافت سے پلیٹ پر جھک گیا۔ کھانے کے بعد وہ سب لاؤنج میں چلے گئے تھے جب کہ ساحرہ کو حیدر اپنے کمرے میں لے گیا تھا نیا میوزک سسٹم دکھانے کے لیے۔ اذکی بے دلی سے برتن اٹھانے لگی تھی۔ کام سے فراغت کے بعد وہ برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ تیز دھوپ اگرچہ آنکھوں میں چبھ رہی تھی مگر وہ ڈھیٹوں کی طرح بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد نجمہ بھی ہاتھ پونچھتی آ گئی۔

نجمہ کافی باتونی تھی اپنی منگنی کا قصہ چٹ پٹے انداز میں سنا کر اب وہ ابا اور اماں کے تازہ ترین جھگڑے کا احوال سنانے لگی تھی۔ اذکی بھی تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ راحت نے انہیں خوش گپیاں کرتے دیکھا تو نجمہ کو جھڑک کر اس کے کوارٹر بھیج دیا۔ جبکہ اذکی کو اوپر والے پورشن کی صفائی پر لگا دیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جب ساحرہ کی آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔

"خالہ جانی! یہ لڑکی ہے بڑے کام کی۔ کسی دن ہماری طرف بھیج دیجیے گا۔ لان کی تھوڑی کانٹ چھانٹ کروا لیں گے اسی سے۔" اس نے اذکی کی طرف رخ کر کے بلند آواز میں کہا تھا۔ اذکی نے راحت کا جواب نہیں سنا۔ وہ ڈبڈبائی نظروں سے کارپیٹڈ سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ آخر رونے کے لیے تنہا کونا بھی چاہیے تھا۔

ماسٹرز کرنے کے بعد حیدر کو بڑی اچھی جاب کی آفر ہوئی تھی۔ عباس بھی گویا اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ راحت کا موڈ قدرے بہتر دیکھ کر انہوں نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کئی لمحے راحت پر سوچ نظروں سے ان کے پرامید چہرے کو دیکھتی رہیں۔ وہ بے حد عقل مند خاتون تھیں۔ جانتی تھیں کہ کس موقع پر کون سی بات کرنا مناسب ہے۔ اپنی بہن سے انہوں نے مشورہ کر لیا تھا۔ ان کی بیٹیاں اور خصوصاً حیدر بھی تقریباً راضی تھا۔ رہے عباس تو انہیں منانا کون سا مشکل کام تھا۔ راحت خود بھی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں جو کہ عباس نے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔

"عباس! ہم پڑھے لکھے باشعور ہیں۔ پرانے وقت گزر گئے ہیں جب بچوں کے ساتھ زور زبردستی کر لی جاتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ بچے خود اپنے بارے میں فیصلے کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ خود ہی سوچیے آپ کہ حیدر ماشاءاللہ پڑھا لکھا ہے۔ اس کا اکیڈمک ریکارڈ نظر انداز کیے جانے والا نہیں۔ حال ہی میں اس نے تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں کہ ایک انڈر میٹرک لڑکی کو اس کے ساتھ نتھی کر دیا جائے۔ اور وہ ساری زندگی ایک گنوار' جاہل کے ساتھ ناخوش گوار زندگی گزارے۔" راحت نے بہت سوچ بچار کے ساتھ ساحرہ کا بتایا ہوا پہلا پتا پھینکا تھا۔

"مگر حیدر نے مکمل رضامندی کے ساتھ نکاح کیا تھا۔" عباس نے اضطراری کیفیت میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل چکے تھے۔

"حیدر نے آپ کی خواہش کا احترام کیا تھا اس وقت۔ آپ اس کی چاہت کا خیال رکھیں۔ یاد رہے کہ حیدر ساحرہ سے محبت کرتا ہے اور میں اپنے اکلوتے بیٹے کو آپ کے فضول فیصلے کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی۔" راحت نے گفتگو کو سمیٹنا چاہا۔ وہ اپنے فیصلے سے عباس کو آگاہ کر چکی تھیں۔ ان کا مقصد بس یہی تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" وہ آزردگی سے کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ راحت نے ان کے چہرے پر پھیلی رنجیدگی کو بغور پڑھا۔

"میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" انہوں نے پہلو بچایا۔

"اصل مسئلہ تو حیدر کا ہے اس نے رات کو مجھ سے بات کی ہے کہ وہ ساحرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

راحت نے اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کیا۔ اب وہ مطمئن ہو چکی تھیں۔

"اذکی کا کیا ہوگا اور یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں اور پھر میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ میں اپنی بھتیجی کے ساتھ یہ ظلم کروں۔ راحت تم حیدر کو سمجھاؤ۔" وہ بھرائی آواز میں گویا ہوئے۔ راحت نے خشمگیں نظروں سے ان کی عرق آلود پیشانی کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ سینہ مسل رہے تھے۔

"حیدر کہہ رہا تھا کہ بابا نہ مانیں کروں گا تو میں اپنی مرضی ہی۔" انہوں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"جانتے تو ہیں آپ کہ کس قدر ضدی طبیعت کا مالک ہے۔ مزاج کے خلاف کچھ برداشت نہیں کر سکتا وہ۔" عباس نے بے یقینی سے راحت کی آنکھوں میں دیکھا۔ انہوں نے سرعت سے نظریں چرائی تھیں۔

"حیدر نے کہا ہے۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائے۔

"میں خود بات کروں گا اس سے۔" عباس نے گویا ایک فیصلہ کیا اور پھر اٹھ کر بیڈ کی طرف بڑھے۔ دراز سے شیشی نکال کر چند ٹیبلٹس زبان کے نیچے رکھیں راحت کندھے اچکا کر اٹھ گئی تھیں۔ ان کا ذہن تیزی سے منصوبہ بنا رہا تھا اور ساحرہ بھی اس میں شریک تھی۔ وہ ہر قدم اس کے مشورے سے اٹھاتی تھیں۔ اب بھی انہوں نے ساحرہ کو مکمل رپورٹ دی ساحرہ نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ وہ خود ہی حیدر سے نبٹ لے گی۔

راحت کی بہن فاخرہ اگرچہ راضی نہیں تھیں مگر ساحرہ کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھیں۔ انہیں اذکی سے دلی ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ یہ کم گو سی لڑکی انہیں بے حد پسند تھی۔ اب بھی بیٹی کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی راحت کی بات نہ مانتیں۔ مگر اس وقت وہ بھی بے بس تھیں کیونکہ ساحرہ نے انہیں اچھا خاصا دھمکا دیا تھا۔ وہ حیدر کو بچپن سے چاہتی تھی اور اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔

عباس کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی لہٰذا وہ جلد ہی سو گئے۔ صبح معمول کے مطابق اٹھے ہی تھے کہ حیدر چلا آیا۔ انہوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ حیدر سے ابھی بات کر لی جائے لیکن ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ سر جھکائے اپنی پسند بتا کر باہر نکل گیا تھا۔ وہ گم صم سے وہیں کھڑے رہ گئے۔ حیدر کے اس طرح رنگ بدلنے نے ان کو بے حد شاک پہنچایا تھا۔ ان کا تنفس تیز تیز چلنے لگا تھا اور بائیں جانب شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ نڈھال سے کارپٹ پر گر گئے۔

راحت فتح مندی سے سرشار بیڈ روم میں آئیں تو عباس کو کارپٹ پر اوندھے منہ پڑے دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ فوراً فون کر کے حیدر کو بلایا۔ بھاگم بھاگ انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ان کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتی وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ بائیس گھنٹوں کے صبر آزما انتظار کے بعد عباس نے آنکھیں کھولیں تو راحت کا نڈھال سا چہرہ نظر آیا۔ عباس نے کرب سے آنکھیں دوبارہ موند لیں۔

ساری زندگی انہوں نے راحت کے کسی فیصلے کے سامنے سر نہیں اٹھایا تھا ہمیشہ وہی کیا جو وہ چاہتی تھیں ان کی ہر جائز ناجائز خواہش کا احترام کیا۔ اذیت سے سوچتے ہوئے انہیں اذکی کا خیال آیا۔ اس کا اداس ویران چہرہ، سوال کرتی نگاہیں۔ انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں تو درد کی تیز لہر سی اٹھی تھی۔

"میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا بیٹی۔ مجھے معاف کر دینا۔" دو آنسو لڑھکتے ہوئے چپکے سے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"میرے جیسے کمزور مرد بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں۔" بہت پہلے کے چند ایک منظر یاد آئے تھے انہیں۔ ماں کی التجائیں، بھائی کا رونا بلکنا اور راحت کی کشش۔ انہوں نے بوسیدہ زندگی کے اس باب کو بند کر دیا تھا ہمیشہ کے لیے۔

"میں نے کیا کھویا کیا پایا۔" ان کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ ڈاکٹرز کے پورے عملے نے انہیں ایک دفعہ پھر گھیر لیا۔ مگر اکھڑی سانسیں ہموار نہیں ہو سکی تھیں۔ چند لمحوں بعد مشینیں بے جان ہو گئیں۔ ڈاکٹرز مایوس باہر نکلنے لگے۔ راحت کی دعائیں ادھوری رہ گئیں وہ فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ حیدر نے آنسو صاف کرتے ہوئے بہنوں کو اطلاع دی روتے بلکتے وہ بابا کے بے جان وجود کو گھر لے آئے تھے۔ راحت غش کھا کر گر پڑیں۔ جب انہیں ہوش آیا تو عباس کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا تھا۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ صدمے سے نڈھال اذکی بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کا تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ روتے بلکتے وہ مختلف کام انجام دے رہی تھی۔

آہستہ آہستہ مہمان جانے لگے۔ راحت نے بھی زندگی کے معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ گھر کی فضا بے حد سوگوار تھی انہی دنوں سدرہ کے سسرال والوں نے شادی کی تاریخ طے کر دی۔ راحت نے سادگی کے ساتھ شادی کے انتظامات کروائے۔ چالیسویں کے بعد ہی سادگی سے نکاح ہوا اور اس سے اگلے روز وہ شوہر کے پاس لندن چلی گئی۔

ساحرہ نے مستقل ادھر ہی ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ہر وقت راحت کے ساتھ چپکی رہتی۔ اذکی اپنے دھیان میں معمول کے کام نبٹا کر کمرے میں گھس جاتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس چھت تلے اگر رہنا ہے تو لبوں کو سینا اور خواہشوں کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ راحت کے حکم کے مطابق وہ صرف کام کے لیے ہی اپنے کمرے سے نکلتی تھی۔ حیدر اگر گھر پہ ہوتا تو وہ اذکی کو ہمیشہ ادھر ادھر کر دیتی تھیں۔

چھ ماہ کے مختصر عرصے میں ساحرہ نہایت دھوم دھام سے اس گھر میں ہمیشہ کے لیے آ گئی تھی۔ راحت نے اپنے سارے ارمان جی بھر کے پورے کیے ہر ہر فنکشن نہایت بہترین تھا۔

ساحرہ نے آتے ہی سب سے پہلے اذکی سے ملاقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ اپنا دلکش روپ اسے دکھانا چاہتی تھی یا پھر اذکی کو یہ جتلانا تھا کہ وہ ہی حیدر کی من پسند بیوی ہے۔

اذکی پتھر سے بنی مورت نہیں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ رات کی تاریکیوں میں جی بھر کر رونے اور دل کا غبار نکالنے کے بعد صبح وہ بے حد لاپروا نظر آتی۔ آہستہ آہستہ وہ ساحرہ کے مزاج کو سمجھنے لگی تھی۔

وہ جان گئی تھی کہ ساحرہ اسے جلانے تڑپانے کے لیے بعض نازیبا حرکتیں کرتی ہے۔ لہٰذا اس نے خود پر خول چڑھا لیا۔ مگر کبھی کبھی یہ خول چٹخ جاتا تھا۔ خصوصاً جب وہ حیدر کے ساتھ ہوتی تھی۔ صبح صبح وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول دیتی تھی تاکہ اس کی کھنکتی ہنسی اذکی کے کانوں تک پہنچ سکے۔ اکثر اپنی سہیلیوں سے گفتگو کرتے ہوئے وہ حیدر کی بے تابیوں کی داستان سنانے لگتی۔ اسے ہمیشہ ساحرہ پر رشک آتا تھا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھی جو چاہے جانے کے لیے بنے ہوتے ہیں۔ ماں باپ کی لاڈلی، ساس کی چہیتی، نندوں کی دلاری اور شوہر کی من چاہی۔ اسے سب کی محبتیں بے دریغ ملی تھیں۔ اسے تو مغرور ہونا ہی تھا۔ جبکہ اذکی نے آنکھ کھولی تو ماں نہیں تھی، لڑکپن گزرا تو باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ ماموں مامی نے ہی آسرا دیا تھا۔ ان کی محبت ہی اس کی کل کائنات تھی مگر ماموں کی طویل بیماری، راحیلہ بھابھی کے روزانہ کے جاہلانہ جھگڑوں نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔ وہ جلد از جلد اسے مضبوط ہاتھوں میں دینا چاہتے تھے۔

مامی کے رشتے کے بھائی نے ہی اذکی کے تایا کے متعلق بتایا تھا۔ اسے بھی پہلی مرتبہ کسی قریبی عزیز کے بارے میں پتا چلا تھا۔ تایا جی کی شفیق صورت دیکھ کر اسے اپنے بابا یاد آ گئے تھے۔ ان کے سینے سے لگ کر ساری محرومیاں بھول گئی تھی وہ۔ ان کے جانے کے بعد سچ مچ کڑی دھوپ کا گماں ہوا تھا اسے۔ جس کے ساتھ اتنا مضبوط تعلق تھا۔ وہ سدا کا لاپروا، اسے لا کر بھول چکا تھا یقیناً۔ اسے نہ حق لینا آیا تھا نہ حق وصول کرنے کے لیے جھگڑنا۔ وہ اول روز کی طرح اب بھی راحت کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتی تھی۔

اگر حیدر کبھی اچانک سامنے آ جاتا تو وہ کونوں کھدروں میں چھپنے لگتی تھی۔ وہ اونچی آواز میں بولتا تو اذکی سہم کر کمرے میں دبک جاتی۔ اگر اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تو وہ زمین آسمان ایک

کر دیتا۔ نجمہ کانپتی لرزتی ادھر ادھر بھاگنے لگتی۔ اذکی کے ہاتھ پیر پھول جاتے، بس ایک ساحرہ ہی واحد ہستی تھی جو اس کے غصے کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی یا پھر حیدر کو اس پر غصہ ہی نہیں آتا تھا۔

شروع سے ہی اذکی تایا جی اور حیدر کے کپڑے دھو کر پریس کر کے ہینگ کر دیا کرتی تھی۔ ان دونوں کے جوتے پالش کر کے شوز ریک میں سجا دیتی۔ البتہ کریڈٹ سارا راحت بیگم کے حصے میں چلا جاتا تھا جن کے سلیقے کی سارے خاندان میں دھوم تھی اور اب ان کی بھانجی نے ان کا تخت سنبھال لیا تھا۔

صبح کے وقت حیدر اور ساحرہ ایک ہنگامہ مچائے رکھتے تھے۔ حیدر آفس جلدی پہنچنے کے لیے شور مچاتا جبکہ ساحرہ یہ ثابت کرنے پر تلی ہوتی تھی کہ سارا گھر اس نے سنبھال رکھا ہے۔ ہاتھوں سے زیادہ زبان چلتی تھی اس کی بھاگتی دوڑتی، کبھی حیدر کی پسند معلوم کر رہی ہے۔ کبھی راحت کو پرہیزی ناشتا پہنچا رہی ہے۔ ساتھ وہ اذکی کو بھی خوب دوڑاتی تھی۔

''اذکی! پیاز کاٹ دو آملیٹ کے لیے۔'' وہ آٹا گوندھ کر ہٹتی تو نیا حکم جاری ہو جاتا۔ اتنے میں ساحرہ برتن لگانے شروع کر دیتی۔ اذکی ملک شیک بنا کر جگ میں ڈالتی اور ساحرہ کمال مہارت سے ٹرے میں سجا کر حیدر کو بیڈ روم میں دے آتی۔ وہ کچن میں برتنوں کے ساتھ الجھ رہی ہوتی اور راحت کی بڑبڑاہٹیں عروج پر پہنچ جاتیں۔

زندگی اسی طرح اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ وقت اپنی چال روانی سے چل رہا تھا۔ اذکی نے اب تو انگلیوں پر حساب لگانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

حیدر کبھی کبھار اسے کاموں میں الجھا دیکھ کر ٹھٹک جاتا تھا جبکہ وہ جان کر بھی انجان بن جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب میں تبدیلیاں آجاتی ہیں مگر راحت اور ساحرہ اول روز کی طرح تھیں مغرور اور خود پسند۔

ساحرہ کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے پر ابھی تک اس کی گود خالی تھی۔ راحت کو بھی فکر نے گھیر لیا تھا۔ لوگوں کے دبے دبے تبصرے اذکی کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ ساحرہ بھی فکر مند رہنے لگی تھی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر ساحرہ نے نئی چال چلی۔ راحت بھی اس کی ہمنوا تھیں۔ دراصل ساحرہ کو حیدر کے بدل جانے کا وہم ہو گیا تھا۔ اولاد ہی پیروں کی زنجیر ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی کے ساتھ ایسا حادثہ ہو چکا تھا جس نے اسے صحیح معنوں میں پریشان کر دیا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ حیدر بھی اس کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلے۔

ساحرہ کو یقین تھا کہ اس کا یہ عمل اعلا ظرفی اور وسیع دل ہونے کا ثبوت بن جائے گا۔ لوگوں کی واہ واہ اور خاندان بھر کی شاباشی اور سب سے بڑھ کر راحت کی مکمل خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔

ساحرہ کی فیملی کے علاوہ کسی اور کو حیدر اور اذکی کے نکاح کی خبر نہیں تھی۔ اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے حیدر اور اذکی کی شادی کا اعلان کر دیا۔ پورے خاندان میں گویا بھونچال آگیا تھا۔ سب بے حد حیران تھے جبکہ ساحرہ کو اصل پریشانی نے اس وقت جکڑا تھا جب اس نے حیدر سے ذکر کیا اور اس نے خاموشی سے سر جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ حیدر کے رویے کو جان نہیں پائی تھی مگر اگلے بہت سے دنوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اگر ساحرہ یہ قدم نہ اٹھاتی تو وہ پھر بھی اذکی کو بیوی کا درجہ دینے والا تھا۔

رہی اذکی تو اس کا سکتہ ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی وہ ابھی تک بے یقین تھی۔ کہاں تو راحت اور ساحرہ سرے سے اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکاری تھیں اور کہاں پل ہی پل میں انہوں نے اس کے مقام کا خود ہی تعین کر دیا۔

شروع شروع میں حیدر قدرے اکھڑا اکھڑا ہی رہا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی آتی گئی۔ اور جب اسے باپ بننے کی خوشخبری ملی تو راحت ولا میں گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی۔ راحت کا موڈ بھی بہت بہتر ہو گیا تھا جبکہ ساحرہ اب اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔ اسے دیکھتے ہی تنفر سے رخ بدل جاتی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہنے لگی تھی اذکی وجہ جانتی تھی کہ یہ سب اس وجود کے مرہون

منت ہے جس نے ابھی اس دنیا میں آنکھ نہیں کھولی تھی۔

ساحرہ کی نظریں بے حد چبھنے والی کلیلی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے اس کی براؤن چمکیلی آنکھوں سے وحشت ہونے لگتی۔

اس نے نو سال اس گھر میں کسی تیسرے درجے کے ملازم کی طرح گزارے تھے حیدر کی منکوحہ ہونے کے باوجود۔ اس نے نو سال حیدر کو دوسرے کنارے پر کھڑے دیکھا اور برداشت بھی کیا جبکہ ساحرہ کا ضبط نو مہینوں میں ہی جواب دے گیا تھا۔

ساحرہ نے حیدر پر احسان کیا تھا وہ اور راحت بیگم وقتاً ''فوقتاً'' اسے جتاتی رہتی تھیں۔ یہ احسان اذکی کے وجود پر بھی کیا گیا تھا۔ اسے فرش سے عرش پر بٹھایا گیا۔ حیثیت سے بڑھ کر ملا یہ راحت کا فرمان تھا جسے سننا اذکی کی مجبوری تھی۔

حیدر خود بھی جانتا تھا کہ ساحرہ ان دنوں کس کرب سے گزر رہی ہے۔ اپنی محبت کا یوں بٹوارا کرنا بہت بڑے ظرف کی بات تھی اور ساحرہ کا ظرف کتنا وسیع ہے اس کا علم صرف اذکی کو تھا۔ حیدر کے جانے کے بعد وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کے ارد گرد چکراتی رہتی اور زبان سے شعلے برساتی راحت نے کبھی ساحرہ کو روکا نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی ایسی کوئی نہ کوئی بات ضرور کر دیا کرتی تھیں جس سے اسے تکلیف پہنچتی رہتی۔ جب اس نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تو راحت بیگم نے زید کو ہاتھوں میں لے کر ساحرہ کی گود میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت ساحرہ نے صاف انکار کر دیا تھا وہ کیونکر اذکی کے بچے کو گود میں لیتی اور پالتی پوستی۔ اپنے انکار کو اس نے بڑے میٹھے لفظوں میں ڈبو کر پیش کیا تھا۔

''یہ تو بہت چھوٹا ہے ابھی، اسے فی الحال ماں کی ضرورت ہے۔'' راحت نے اسے ساتھ لپٹا کر چوما۔ وہ اس کی آزردگی محسوس کر چکی تھیں۔

گھر آکر ایک دفعہ پھر روٹین لائف شروع ہو گئی۔ راحت کی طبیعت اگرچہ ٹھیک نہیں رہی تھی مگر پھر بھی وہ دونوں بچوں کو اٹھائے رکھتیں۔ اذکی کو کم ہی بچوں کے قریب آنے دیتی تھیں وہ۔ جب بچوں کو فیڈ کروانا ہوتا تو وہ اسے آواز دے لیتیں۔ اس کے بعد اذکی کاموں میں مصروف ہو جاتی اور راحت انہیں اپنے کمرے میں لے جاتی تھیں اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

اچانک موسم کی تبدیلی کی وجہ سے دونوں بچے بیمار ہو گئے تو مجبوراً'' راحت نے بچوں کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ تو ترس کر رہ گئی تھی بچوں کے لیے۔ جوں جوں وہ دونوں بڑے ہو رہے تھے ماں کا لمس پہچاننے لگے تھے۔ خود ہی اوپری گود کو محسوس کر کے رونا چلانا شروع کر دیتے۔ راحت انہیں پچکارتی ہی رہ جاتیں مگر جوں ہی اٹھاتیں دونوں کا بھونپو آن ہو جاتا تھا اسی لیے راحت کا موڈ خراب رہنے لگا تھا۔ بچوں کے رونے کی آوازا نہیں ناگوار گزرنے لگتی۔

اس دن بھی وہ دیا کو تخت پر لٹا کر دودھ لینے چلی گئی تھی واپس آئی تو راحت کا تخت گیلا ہو چکا تھا۔ انہوں نے غصے سے چند ماہ کی بچی کو چپت رسید کی۔ دیا نے رونا شروع کر دیا اور راحت کا پارہ بھی چڑھ گیا تھا۔

''آفتی طوطے ہیں یہ بچے..... ریں ریں ختم نہیں ہوتی ان کی۔'' شور اور گندگی ان کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔ اور کچھ ساحرہ بھی انہیں بھڑکانے لگی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں کو طول دے کر ہنگامہ مچا دیتی تھی اور پھر معصومیت کا ڈھونگ رچا کر رونا چلانا شروع کر دیتی۔ بچوں کی پہلی اور پھر دوسری سالگرہ انہیں ڈراموں کی نذر ہو گئی۔ ان ہی خشک اور روکھے پھیکے دنوں میں ساحرہ نے اس کے ساتھ شدید جھگڑا کیا۔ ہمیشہ کی طرح چپ رہنے کی بجائے اس نے ساحرہ کو دو ٹوک جواب دے کر گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال لیا تھا۔ راحت کو بھی اذکی کا بولنا پسند نہیں آیا۔ انہوں نے حیدر کو فون کر کے بلایا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی۔ ساحرہ روتی دھوتی میکے چلی گئی تھی۔ راحت کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی لاڈلی بھانجی کے آنسو دل پر گر رہے تھے۔

''لے جاؤ اسے میری نظروں سے دور..... ورنہ کچھ

کرلوں گی میں۔" وہ اپنی تعلیم بھلائے جاہل عورتوں کی طرح واویلا کرنے لگی تھیں۔

حیدر نے بھی پہلی مرتبہ اس پر چڑھائی کرنے کی بجائے کچھ اور سوچا اور پھر اسے بیگ تیار کرنے کا حکم دے کر باہر نکل گیا۔ اذکی خاموشی سے چند ضرورت کی اشیا بیگ میں رکھ کر بچوں کو لیے اس کے پیچھے جا رہی تھی جب راحت کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"اب جا رہی ہو تو اس گھر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے اس گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔"

حیدر اسے مامی کی طرف چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہفتے تک اس نے فلیٹ کا بندوبست کر کے ضروری سامان ڈالا اور پھر اسے لینے چلا آیا۔ اس نے اس چھوٹے سے فلیٹ میں نہیں گویا جنت میں قدم رکھے تھے۔ "اپنا گھر" یہ احساس ہی بڑا دلنشین تھا۔ وہ ساری تھکن، محرومیاں، اذیتیں بھلائے اپنے گھر کو سنوارنے میں مشغول ہو گئی۔ بچے گھر اور پھر حیدر آنکھوں نے پہلی مرتبہ کچھ رنگوں اور خوابوں کو محسوس کیا تھا۔

راحت کو جب فلیٹ کے متعلق خبر ہوئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے حیدر سے باز پرس کی تو وہ لاپروائی سے بولا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ میری نظروں سے دور لے جاؤ اسے۔ اب ظاہر ہے مجھے کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا ہی تھا۔"

ساحرہ اور راحت کی تدبیریں الٹ گئی تھیں۔ اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ حیدر اذکی کو چھوڑ دے، چونکہ مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔ حیدر کو اولاد چاہیے تھی سو مل گئی۔ وہ اب اذکی کو نکلوانا چاہتی تھی مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔

اذکی کو مطمئن دیکھ کر اس کا حسد نفرت میں بدلنے لگا تھا۔ بچے گھر، شوہر وہ جاہل ان پڑھ عورت کس قدر مکمل تھی جب کہ وہ خود کیا تھی ایک خوب صورت، چمکتا دمکتا ڈیکوریشن پیس۔ سو اس نے اذکی کے سکون میں سخت نوکیلا پتھر پھینک کر سب کچھ منتشر کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر آ کر ساحرہ نے بھرپور نیند لی تھی۔ دو تین گھنٹے سونے کے بعد اس وقت وہ فریش تھی۔ وہ نہا کر باہر نکلی تو فون بجنے لگا تھا۔ دوسری طرف اس کی سہیلی ثمن تھی کافی دیر اس سے گپ شپ لگانے کے بعد اس نے فون رکھ کر اپنا جائزہ لیا۔ جدید تراش خراش کا خوب صورت سوٹ اس کے سراپے پر سج گیا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی تو دیا پر نظر پڑی۔ ایک جاندار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ وہ دیا کے قریب بیڈ پر لیٹ کر اس کے من موہنے سے نقوش دیکھنے لگی۔ خوب صورت ناک، چھوٹا سا دہانہ، لمبی لمبی سنہری پلکیں۔ اس کے نقوش حیدر سے بے حد ملتے تھے۔ دیا کا انتخاب اس نے اسی لیے ہی کیا تھا ورنہ زید میں اذکی کا عکس دیکھ دیکھ کر اس کا بی پی شوٹ کر جاتا تھا۔

دیا جب اٹھی تو ایک دفعہ پھر مما مما کی گردان شروع کر دی تھی اس نے، تنگ آ کر اس نے ہولے سے جھنجھوڑا تھا اسے۔

"میں بھی ماں ہوں تمہاری۔"

"نہیں..... آپ نہیں مما....." ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس نے چلانا شروع کر دیا تھا۔

ساحرہ نے نجمہ کو آواز دے کر دودھ کی بوتل منگوائی اور اس کے لبوں سے لگا دی۔ شام کو حیدر آیا تو دیا اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ ساحرہ آئسکریم باؤل میں نکال کر اسے کھلا رہی تھی اور وہ نخرے کر کر کے کھا رہی تھی بلکہ زیادہ منہ اور ہاتھوں پر مل رہی تھی۔

"ارے یہ کون ہے، کارٹون؟" حیدر نے کوٹ پھینک کر دیا کو اٹھا لیا۔

"کدل (کدھر) کارٹون....." اس نے آئسکریم سے لت پت ہاتھ حیدر کے منہ پر رکھا۔

"یہ ہے۔" حیدر نے اس کے گال پر بوسہ دیا۔

"میں..... کارٹون۔" وہ کھلکھلائی۔ حیدر اسے گدگدانے لگا تھا۔ وہ بھی باپ سے کافی اٹیچ تھی۔

فریش ہو کر اس نے جوس پیا اور پھر ماں کو سلام کرنے ان کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ ساحرہ نے دیا کے کپڑے چینج کیے تھے۔ حیدر جب آیا تو پنک فراک پہنے گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے محبت پاش نظروں سے بیٹی کے چہرے کو دیکھا۔ اسے اچانک بابا کی بات یاد آئی تھی۔ وہ برسات کی ایک خوب صورت شام تھی۔ ان دنوں اس نے نیا نیا کالج جوائن کیا تھا۔ لان میں کرکٹ کھیلتے ہوئے اچانک زوردار شاٹ لگا تھا اور بال اڑتے ہوئے سدرہ کے ماتھے پر جا لگی۔ وہ چیختی ہوئی گھاس پر دو زانو بیٹھ کے رونے لگی تھی۔ جبکہ حیدر نے بیٹ پھینک کر ہنسنا شروع کر دیا۔ سدرہ کی روتی صورت دیکھ کر اس نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ اسی اثنا میں بابا بھی چلے آئے۔

"کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو۔" بابا نے فکرمندی سے اس کے چہرے پر پھیلے آنسوؤں کو دیکھا۔ سدرہ نے پاس رکھا بیٹ اٹھایا اور حیدر کی ٹانگ پر دے مارا اور چلائی۔

"اس نے مجھے مارا ہے بابا۔ دیکھیں میرا ماتھا۔" وہ روتے ہوئے بابا کے کندھے سے جا لگی۔ انہوں نے محبت سے اس کے ماتھے کو چوما اور پھر ساتھ لپٹا کر حیدر کو گھورا۔

"گھر کو کرکٹ گراؤنڈ سمجھ رکھا ہے۔ آنکھوں پر عینکیں چڑھا کر کھیلو گے تو یہی ہو گا۔ چلو سوری بولو بہن سے۔"

"میں کیوں بولوں سوری، جان بوجھ کر تو نہیں مارا میں نے۔ خود ہی بے نتھے بیل کی طرح جھومتی ہوئی آ گئی تھی سامنے۔ بال نے تو پھر لگنا ہی تھا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ بابا کو شدید غصہ آ گیا تھا اس کے انداز پر۔

"حیدر! سنا نہیں تم نے۔"

"سوری....." اس نے جان چھڑائی اور بیٹ جھک کر اٹھایا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے معافی مانگنے کا۔" وہ بغیر ان کی طرف دیکھے پلٹنے لگا تھا جب بابا نے پکارا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"سوری بولنے کا طریقہ سیکھنے۔" وہ پیچھے سے چلایا۔ بابا کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی انہوں نے آواز دے کر اسے واپس بلایا تھا۔ وہ منہ بناتا ہوا پلٹ آیا۔

"سنو حیدر یہ بیٹیاں بہت نازک، بہت پیاری ہوتی ہیں۔ جب تمہاری بیٹی ہو گی تو پھر تم سمجھو گے۔" اچانک ہی وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس وقت تو اس نے لاپروائی سے سر ہلا دیا تھا مگر اب اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت سے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹے تھے۔

"کل کو اگر زید کرکٹ کھیلتے ہوئے دیا کو بال مارے تو پھر....." حیدر نے سوچا اور اس کے دل کو کسی نے مٹی میں بھینچا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دیا کو سینے سے لگا لیا۔

"مما پاس جانا ہے۔" وہ باپ سے لپٹتے ہوئے منمنائی۔ حیدر نے موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر اس کی انگلی پکڑ لی۔ ساحرہ کچن میں تھی۔ وہ دروازے کے قریب آ کر بولا۔

"ساحرہ! میں ذرا دیا کو اذکی سے ملوانے لے کے جا رہا ہوں، دو گھنٹے تک آ جاؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" ساحرہ نے برنر بند کر کے چمچہ سلیب پر پٹخا۔

"دیا نہیں جائے گی ادھر، بمشکل میں نے اسے بہلایا ہے۔"

"یہ ضد کر رہی ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تو کرنے دو، تمہیں کیا ہے جاؤ اپنا کام کرو۔ اسے میرے پاس چھوڑ دو۔ اسی طرح عادی ہو گی یہ۔" ساحرہ نے ہاتھ پونچھ کر دیا کا بازو پکڑ لیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

حیدر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مختلف سوچوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ کبھی ساحرہ کے چہرے کی روشنی دل کو منور کرتی اور کبھی اذکی کی اداسی اور ویرانی بے چین کر دیتی۔ اپنے پاس رکھی چابی سے لاک کھول کر وہ اندر آیا تو اذکی پہلے والی کیفیت میں

بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بھی اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔ نبض چیک کی تو بخار سے جل رہا تھا اس کا بدن۔ اس نے سرعت سے اذکی کو اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ پھر ڈاکٹر کو فون کیا۔ چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے پرچے پر چند دوائیاں لکھیں۔

"یہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں' انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ میں نے انہیں نیند کا انجکشن دیا ہے۔ چند گھنٹے یہ پرسکون نیند لے سکیں گی۔" ڈاکٹر نے شائستگی سے کہتے ہوئے بیگ سنبھالا۔ ڈاکٹر طارق کے جانے کے بعد اس نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اذکی کے ماتھے پر رکھیں۔ رات تک اس کا بخار کچھ کم ہوا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے دیا کو پکارنا شروع کر دیا۔ حیدر نے اٹھ کر لائٹ آن کی پھر ہاتھ بڑھا کر اسے تکیے کے سہارے بٹھایا۔ حواس قدرے بہتر ہوئے تو اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ نجانے کب وہ سوچتے سوچتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اچانک ہی بدن ٹوٹنے لگا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ زید کو ہی اٹھا کر بستر پر لٹا دیتی۔ زندگی کے تلخ باب کو سوچتے ہوئے ساری طاقت نچڑ کر رہ گئی تھی۔

اس نے گردن موڑ کر زید کو دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں اس بے حس شخص پر ٹک گئیں۔ اذکی کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ حیدر نے بھی اس کی نظروں کی تپش محسوس کر لی تھی۔ تاہم اس نے اذکی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آیا تو ہاتھ میں سوپ کا باؤل پکڑ رکھا تھا۔

"یہ پی لو پھر دوا کھا لینا۔" حیدر نے باؤل اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خاموشی سے پکڑ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"پتا نہیں میری بچی نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔" اس کی بے قرار ممتا کو کسی پل چین نہیں تھا۔ حیدر اس کی بے چینی کی وجہ جانتا تھا اسی لیے رسانیت سے بولا۔

"اذکی! دیا کی فکر نہ کرو۔ وہ بہت خوش ہے وہاں' ساحرہ بہت خیال رکھے گی اس کا۔ پھر امی بھی ہیں۔"

"میں اپنی ممتا کا کیا کروں' کسی پل سکون نہیں آتا مجھے۔" وہ بھرائی آواز میں گویا ہوئی۔

"عورت کی حیثیت ہی کیا ہے اور پھر مجھ جیسی عورت کی۔" اس نے آنسو صاف کر کے تکیہ پر سر پٹخا۔

"جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ گھر ہے تو شوہر کا' اولاد ہے تو شوہر کی۔ مرضی ہے تو شوہر کی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اذکی! خاموش ہو جاؤ پلیز۔" اسے بے تحاشا روتے دیکھ کر حیدر نے التجا کی۔ پہلی مرتبہ اس کا لہجہ نہایت نرم تھا اور آواز بے حد پست۔

"میں دیا کو لانا چاہ رہا تھا مگر ساحرہ....."

"ہاں جانتی ہوں میں کہ اس عورت سے کوئی خوشی برداشت نہیں ہوتی میری۔ یہ میں ہی ہوں کہ ایک عمر انگاروں پر چلتی رہی۔ نو سال اذیت کی بھٹی میں گزارے۔ آپ کے گھر میں کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر زندگی جی۔ آپ کی ماں اور بیوی کی ہر بات مانی' طنز و طعنے برداشت کیے۔ عزت نفس کا گلا دبایا۔ صرف اور صرف ایک چھت کے لیے' روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے پل پل لمحہ لمحہ مرتی رہی میں اور آپ۔" اس نے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"آپ کیا کر سکتے ہیں حیدر صاحب' کچھ بھی نہیں۔ انصاف تو دور کی بات آپ تو اب بھی اذکی کی خاطر نہیں آئے۔ اس عورت کی خاطر جس نے نو سال آپ کے نام پر قربان کیے۔ کون دے گا حساب مجھے ان نو سالوں کا۔" اس کے بال بکھر کر چہرے اور گردن سے چپک گئے تھے جب کہ سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔

"آپ تو اپنے بیٹے کے لیے آئے ہیں نا اس کے لیے۔" اس نے بے دردی سے کمبل کھینچا۔

"لے جائیں اسے بھی۔ اپنی محبوب بیوی کی خوشی

پوری کر دیں۔ وہ یہی چاہتی ہے نا' سو آپ اس کی خواہش کا احترام کریں۔ جائیں آپ۔" وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔ حیدر نے اسے بال نوچتے دیکھ کر تیزی سے پکڑا۔ زید بھی اٹھ گیا تھا اور اب خوفزدہ نظروں سے ماں کو تک رہا تھا۔

"اذکی ہوش کرو' کیا پاگل پن ہے یہ۔" حیدر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"نہ آپ نے مجھ سے محبت کی نہ قدر کی' پاگل ہو گئی ہوں میں نہیں خواہش رہی جینے کی۔ اب جی کر کرنا بھی کیا ہے۔" اس نے بے دردی سے لب کچلے۔ حیدر نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"پلیز اذکی بس بھی کرو' مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے نرمی سے اذکی کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم چپ کر کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ حیدر نے پانی کا گلاس اس کے سوکھے لبوں سے لگایا۔ پھر زید کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا تھا۔ زید کو سلا کر اس نے تمام لائٹس آف کیں سوپ ٹھنڈا ہو چکا تھا وہ مائیکرو ویو میں گرم کر کے لے آیا۔ اذکی بھی شاید تھک گئی تھی اسی لیے جب حیدر نے اسے سوپ پلانا شروع کیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ خالی باؤل میز پر رکھ کر اس نے میڈیسن نکالیں۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئی تھی۔ حیدر نے بھی دوسری طرف آ کر تکیہ درست کیا اور دراز ہو گیا۔



ساحرہ نے دیا کے لیے دلیہ بنا کر فریج میں رکھا اور پھر اس کے بجتے سائرن کو خاموش کروانے کے لیے ٹی وی لگا دیا۔ مگر دیا ہی کیا جو چپ کر جائے۔ اس نے اسے ریموٹ پکڑا کر بہلانا چاہا مگر دیا نے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ وہ اسے لے کر لان میں چلی آئی۔ اوٹ پٹانگ سی حرکتیں کر کے اس نے دیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پچھلے دو تین دن سے بخار کی وجہ سے نہ تو وہ سو رہی تھی نہ ہی کچھ کھا پی رہی تھی۔ مزاج بھی چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔

ساحرہ نے اسے جھولے پر بٹھایا۔ مگر اس نے احتجاجاً چلانا شروع کر دیا تھا۔ تنگ آ کر وہ اسے لیے اندر چلی گئی۔ راحت اس وقت آرام کر رہی تھیں۔ اس نے کھانا کھا کر برتن سنبھالے۔ دلیہ پیالے میں ڈال کر وہ بیڈ روم میں آ گئی۔

آج حیدر نے نہیں آنا تھا۔ دو دن سے وہ "ادھر" ہی تھا اسی وجہ سے ساحرہ کا موڈ سارا دن خراب رہا۔

"اونہہ..... اہمیت جتانے کے اوچھے ہتھکنڈے۔" حیدر نے فون پر اسے اذکی کی خرابی طبیعت کا بتایا تھا۔ ساحرہ نے ریسیور پٹخ کر تنفر سے سوچا۔

تھوڑا سا دلیہ زبردستی اسے کھلا کر اس نے دوا دی۔ جو کہ اس نے تھوڑی کھائی اور زیادہ گرائی۔

دو دن سے دیا کو شدید بخار تھا وہ ساری رات روتی رہتی۔ اس کی وجہ سے وہ بھی بے آرام رہی تھی۔ دن کو بھی سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ساحرہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں جبکہ دیا کا شاید آج بھی جاگنے اور جگانے کا پروگرام تھا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دیا کسمساتے ہوئے اٹھ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ ساحرہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

"عجیب مصیبت گلے میں ڈال لی ہے۔" اس نے دیا کے بازو کو سختی سے پکڑ کر دوبارہ لٹایا۔ وہ بھاں بھاں کر کے چلانے لگی تھی۔ روتے روتے اسے شدید کھانسی آ گئی۔ ساحرہ نے اس کی کمر سہلا کر سانس ہموار کیا۔ پانی پلا کر آخری کوشش کے تحت اس نے دیا کو تھپکنا شروع کر دیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا۔ وہ سرعت سے اٹھی اور دراز میں سے ایک درمیانے سائز کی شیشی نکال لائی۔ دودھ کی بوتل میں اس نے ننھی ننھی دو گولیاں مکس کیں۔ اور دو پانی کے ساتھ خود نگل لیں۔ دیا کے منہ سے بوتل لگا کر اس نے اطمینان بھرا سانس خارج کیا۔ کچھ دیر بعد دیا اونگھنے لگی تھی۔ اسے بھی نیند کے شدید جھونکے آنے لگے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ غافل ہو گئی۔

حیدر ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ اذکی کی حالت دیکھ کر نجانے کیوں اس کا دل موم ہوا جا رہا تھا۔ وہ

غمگین تھی تو حیدر بھی خوش نہیں تھا۔ وہ متضاد کیفیات کا شکار تھا۔

جن دنوں وہ اذکی کو اس نام نہاد بندھن سے آزاد کرنے کا سوچ رہا تھا۔ ساحرہ وہ تکلیف دہ ڈاکٹری رپورٹس لے آئی۔ اس کی التجا اور امی جان کی خواہش جان کر وہ کچھ پل خاموشی سے سوچتا رہا۔ اسے وہ دونوں درست لگی تھیں اور پھر بچے کی خواہش بھی انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھی۔

بظاہر اس نے ساحرہ کے مجبور کرنے پر اذکی کو بیوی کا درجہ دیا تھا مگر لاشعور میں یہ خواہش نجانے کب سے چھپی تھی۔

جب اذکی نے ماں بننے کی خبر اسے دی تھی تو گویا اسے دنوں جہان کی خوشیاں مل گئیں۔ وہ بے حد خوش تھا اور ساحرہ بھی اس کی خوشی میں شریک تھی۔ ڈاکٹر نے جڑواں بچوں کی نوید سنائی تو اس نے اور امی نے ساحرہ کی گود میں زید کو ڈال دیا تھا لیکن ساحرہ نے خود ہی انکار کر دیا۔

پر اب جبکہ دونوں بچے اچھے خاصے سمجھ دار ہو گئے تھے ماں کے لمس کو پہچانتے تھے تو ساحرہ نے دیا کو لینے کے لیے اسے مجبور کرنا شروع کر دیا۔

ساحرہ نے اس کے سامنے دو شرائط رکھی تھیں اور حیدر کو ہر حال میں اس کی ایک شرط ماننا تھی۔ سو اس نے دیا کو اس کے حوالے کر دیا۔ دوسری شرط ماننا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ خود کو اس موڑ پر انتہائی بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس کی یہی کمزوری شاید ساحرہ کے ہاتھ جا لگی تھی۔

لیکن اذکی کی حالت کے پیش نظر اس نے ساحرہ کی دوسری شرط پر توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار تھی۔ سوتے میں اٹھ کر چیخنے لگتی' بالوں کو نوچتی اور خود کو کوستی رہتی۔ زید بھی الگ سہما سہما سا تھا۔ سو اس نے دل کی آواز پر کان بند کر کے دماغ سے سوچنا شروع کر دیا۔ امی نے کبھی اذکی کو دل سے قبول نہیں کیا۔ ساحرہ اگر انہیں پوتا پوتی دے دیتی تو اذکی کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ ساحرہ بھی اس کے وجود کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنی تکلیف کم کرنے کے لیے اس نے اذکی کو اذیت پہنچانے کا الگ طریقہ سوچا تھا یعنی دیا کو اس سے چھین کر۔

وہ صبح بغیر ناشتا کیے آفس چلا آیا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ راحت ولا ساحرہ سے ملے بغیر آفس میں موجود تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح وہ دلجمعی سے کام نہیں کر سکا۔ سر میں الگ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے کچھ لمحے سوچا اور پھر اپنے سامنے رکھی فائل بند کر کے پہلا کام وکیل کو فون کر کے چند کاغذات تیار کرنے کے لیے کہا۔ اس نے فلیٹ اذکی کے نام کر دیا تھا۔ جبکہ بینک میں موجود تین لاکھ رقم میں مزید پچاس ہزار کا اضافہ کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بخاری صاحب سے چھٹی لی اور راحت ولا چلا آیا تھا۔ وہ بیڈ روم کے دروازے تک آیا تو ساحرہ کی سوئی سوئی آواز نے قدم روک لیے۔

"حیدر صرف اور صرف میرا ہے۔ مجھے اس سے شدید محبت ہے۔" وہ تفخر سے بول رہی تھی۔ حیدر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ساحرہ اس کے معاملے میں کس قدر شدت پسند ہے۔ اس نے کوٹ دائیں کندھے پر منتقل کر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

"میں نے جسے چاہا اسے پایا بھی۔ کوئی میرے راستے کی رکاوٹ بنے میں اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہوں۔ پھر اذکی کیا چیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حیدر میری دوسری شرط ماننے پر تیار ہو جائے گا۔ کیونکہ اذکی اسے مجبور کرے گی۔ وہ بچی کے بغیر نہیں رہ سکتی' بچی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی اور میں...... میں حیدر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

حیدر نے دروازے کو ہولے سے دھکیلا' دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ساحرہ کی اس طرف پشت تھی یا پھر وہ فون پر ہی اس قدر محو تھی کہ اسے حیدر کی آمد کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ورنہ وہ تو اس کی خوشبو سے ہی پہچان لیا کرتی تھی۔

"میں نے ہر بازی سوچ سمجھ کر کھیلی ہے۔ جیت ہمیشہ میرے مقدر میں لکھی گئی ہے۔ اس وقت بھی جب اذکی راحت ولا میں حیدر کی منکوحہ بن کر آئی تھی اور اب بھی جبکہ وہ اس کے دو بچوں کی ماں ہے۔ اسے پیچھے ہٹنا ہے ہر صورت۔"

حیدر ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ساحرہ کی پشت کو دیکھا۔

"دنیا کے جس کونے میں بھی دیا اور زید رہیں بس میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔ ویسے بھی وہ جہاں رہیں حیدر کے بچے ہی کہلائیں گے اسی کے نام سے پہچانے جائیں گے۔ حیدر کو بھی یقین و اطمینان رہے گا کہ اس کے بچے موجود ہیں۔ پھر وہ صرف اور صرف میرا ہو گا۔ کوئی اذکی ہمارے درمیان نہیں آئے گی اور نہ ہی کسی اور دوسری عورت کا دھڑکا۔"

وہ حقارت سے کہہ رہی تھی جبکہ حیدر کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ الفاظ تھے کہ شعلے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سامنے کھڑی عورت نے بھی اس تپش کو محسوس کر لیا تھا۔ جب وہ پلٹی تو حیدر کو موجود دیکھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔

"تم کب آئے۔" وہ گڑبڑا گئی تھی۔ حیدر لب بھینچے دو قدم آگے بڑھا اور ساحرہ نے اس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی اور چہرے کے تناؤ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہا تھا۔ اسے اسی پل حیدر سے خوف محسوس ہو رہا تھا شدید خوف۔

"بہت بڑی ایکٹر ہو تم اور میں۔" دھیمے لہجے میں بھوکے شیر کی سی غراہٹ تھی۔ ساحرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"میں اس دنیا کا احمق ترین آدمی ہوں۔" اس نے استہزائیہ ہنس کر ساحرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر تھپڑ دے مارا۔ ساحرہ کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حیدر کے تنے تنے نقوش کو دیکھا۔ حیدر نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے بے یقین سی کھڑی تھی۔ وہ اذکی نہیں ساحرہ تھی۔ اذکی کو مارنا معمولی واقعہ تھا لیکن ساحرہ کو مارنا معمولی بات نہیں تھی۔

"تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔" وہ غرائی۔ حیدر نے لگاتار دو اور تھپڑ اس کے منہ پر مارے۔ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس نے اسے زوردار جھٹکا دیا تھا وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں شوٹ کر دوں ڈرامے باز عورت۔" وہ دہاڑا۔ پھر اسے بازو سے پکڑتے ہوئے دوبارہ اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

"بہت شاطر دماغ ہے تمہارا۔ میں کوئی چال سمجھ ہی نہیں سکا۔ ہوں نا بے وقوف۔" وہ اذیت سے کہتے ہوئے ایک پل کو رکا۔

"بہت ذہین ہو تم۔ میں متاثر تھا تمہارے اس شیطانی دماغ سے۔ اس حسن سے' تعلیم سے خاندان سے۔" اس نے آنکھوں میں امڈنے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے لب کچلے۔

"تم سے بہتر تو وہ جاہل عورت ہے جس نے اپنے دل کے ٹکڑے کو تمہاری گود میں ڈالا۔ بقول میری ماں کے وہ نیچ عورت' بہت بلند ہے۔ جو میرے دیے ہر دکھ ہر درد کو ان دو دنوں میں بھول چکی ہے کیونکہ حیدر نے اس سے پہلی مرتبہ محبت سے بات کی ہے۔ اس نے ان دو دنوں کے صدقے ہمیشہ کے لیے اپنی بچی کو تمہیں دے دیا۔ رات کو اس نے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا میں تمہیں یہ خوشخبری رات ہی کو سنا دینا چاہتا تھا۔ اذکی نے بخوشی رضامندی ظاہر کی تھی۔ میرے ضمیر پر پڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ لیکن رات کے پچھلے پہر میں نے اسے روتے دیکھا بے تحاشا روتے ہوئے۔ اس نے میری محبت پر ممتا کو قربان کر دیا تھا مگر اپنا دل'" حیدر کی آواز رندھ گئی۔

"انسان کس مقام پر بے بس ہوتا ہے؟ اور کس مقام پر رسوا ہوتا ہے؟

میں بے بس اس وقت ہوا تھا جب بابا کے چہرے پر آزردگی پھیلی دیکھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں امید کے

دیے روشن تھے میں انکار کرتا تو وہ دیے بجھ جاتے۔ میں نے خود کو بے بس پایا۔ پہلی مرتبہ بابا کی محبت میں خود کو مجبور پایا تھا میں نے اور دوسری مرتبہ تمہاری محبت میں۔ جب بیمار باپ کے سامنے تم سے شادی کا اعلان کیا تھا۔ میں اس وقت بھی لاچار تھا۔ کیونکہ تمہاری چاہت نے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں پاؤں میں۔ اور آج اسی محبت نے مجھے اس مقام پر لا کر رسوا کر دیا ہے۔ تم نے کیسی محبت کی مجھ سے کہ ہر مقام پر مجھے گناہ گار کرتی رہیں' اللہ کا مجرم بناتی رہیں۔"

وہ رو رہا تھا۔ ساحرہ نے بے یقینی سے اس کے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھا۔ حیدر نے دھند کے پار بیڈ پر کمبل میں سوئی اپنی بیٹی پر نگاہ ڈالی۔ وہ ساحرہ کے چلانے اور حیدر کے دہاڑنے پر بھی نہیں اٹھی تھی۔ حالانکہ اس کی نیند بے حد ہلکی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا اور وہ اٹھ جاتی۔

"ساحرہ! میں نے سوچا تھا کہ تمہاری دوسری شرط مان لوں۔ میں اذکی کو چھوڑنے والا تھا ہمیشہ کے لیے۔ تمام کاغذات تیار ہیں۔ میں تمہیں اور امی کو انگلینڈ لے جانا چاہتا تھا اس لیے کہ مجرم ہمیشہ منہ چھپاتا ہے۔ لیکن اب۔" وہ رکا تو ساحرہ کی سانسیں بھی تھم گئیں۔

"میں جا رہا ہوں ساحرہ! میرے جانے کے بعد ایک لمحے کے لیے ضرور سوچنا کہ تم نے واقعی مجھ سے محبت کی تھی یا محض میری ماں کی انا تھی یا پھر تمہاری ضد۔"

حیدر پلٹ کر بیڈ کی طرف آیا۔ ساحرہ نے تیزی سے اس کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔

"تم ..... مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو حیدر' میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔"

وہ گڑگڑاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ حیدر نے تنفر سے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا۔

"تم اس سونے کے محل میں اکیلی رہنا۔ تنہائی تو ویسے بھی پسند ہے تمہیں۔" وہ غرایا تھا۔ راحت بھی شور سن کر آ گئیں۔

"جو کیا تمہاری ماں نے کیا' میں تو محض مہرہ تھی۔" راحت کو دیکھ کر وہ چیخی تھی۔ راحت نے بھی منٹوں میں صورتِ حال جان لی تھی۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لاپروائی سے بولیں۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ تمہاری خاطر بہو اور پوتے پوتی کو گھر سے نکالا۔ ترستی رہتی ہوں ان کی صورت دیکھنے کے لیے..... بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" وہ اپنا واویلا کرنے لگیں۔ حیدر نے ماں کی طرف دیکھے بغیر دراز میں سے چند کاغذات نکالے۔

"خالہ حیدر کو روکیں یہ جا رہا ہے۔" ساحرہ سارا غرور طنطنہ بھلائے التجا کر رہی تھی۔ حیدر نے لیدر کے بیگ میں ضروری سامان رکھا۔ اور پھر کمبل ہٹا کر دیا کو اٹھانے لگا۔

"امی ..... دیکھیں دیا کو کیا ہوا ہے۔" اس کی متوحش پھٹی پھٹی آواز نے راحت کو بے حد پریشان کر دیا۔ وہ گرتم پڑتم بیڈ تک آئیں۔

"ارے یہ تو ٹھنڈی پڑی ہے۔" راحت نے اس کے جسم کو چھوا۔ حیدر دیوانوں کی طرح اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کر رہا تھا۔ راحت نے نجمہ کو پکارا۔

"ڈاکٹر کو فون کرو۔"

"امی..... دیا۔" وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ دیا کا گلابی چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا جب کہ ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔ راحت نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"ہائے ماں صدقے کیا ہوا ہے میری بچی کو۔" دیوار سے لگی ساحرہ نے راحت کی بلند آواز کو سنا۔ حیدر کی صدمے سے چور آواز نے اس کی رہی سہی ہمت بھی نچوڑ لی۔

"اماں..... میری بیٹی مر گئی۔" اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

"دیا مر گئی۔"

وہ بڑبڑائی اور پھر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے وہ گرتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں ساحرہ ہوں۔ مرسلین وجاہت کی اکلوتی بیٹی۔ محبت' ذہانت' حسن اور دولت سے مالا مال۔

بچپن سے ہی مجھے احساس دلایا گیا تھا کہ میں بہت خاص ہوں۔ اپنے ماں باپ کے لیے' دادی دادا کے لیے' ننھیال والوں کے لیے۔ ڈیڈی مجھے بے انتہا چاہتے تھے۔ انہوں نے میری ہر ضد پوری کی۔ مجھے بے تحاشا محبت دی لیکن ایک وقت ایسا آیا تھا کہ میرے عزیز از جان ڈیڈی نے نہ صرف میری خواہش رد کی بلکہ مجھ سے شدید ناراض بھی ہوئے۔

انسان جذبات میں اندھا ہوتا ہے اور محبت میں بے تحاشا اندھا..... میں نے ہوش سنبھالا تو حیدر کا نام اپنے نام کے ساتھ جڑا سنا۔

نانی ہمیشہ بڑے دلار سے کہتی تھیں کہ ساحرہ میرے حیدر کی دلہن بنے گی۔ شعور کے ساتھ ساتھ حیدر کا خیال پختہ ہوتا گیا۔ اسی لیے میں نے ہمیشہ اس پر اپنا حق جتایا۔ کیونکہ نانی کے ساتھ خالہ نے بھی ہمیشہ مجھے یہی جتانے کی کوشش کی تھی کہ حیدر مجھے چاہتا ہے' مجھ سے محبت کرتا ہے۔ جو خواب خالہ نے میری آنکھوں میں اتارے تھے ان کی مدت بے حد طویل تھی۔ میں نے چھوٹی سی عمر میں بڑا لمبا سفر طے کر لیا تھا۔ جب حیدر کے نکاح کی خبر مجھ تک پہنچی تو میرے قدموں تلے گویا انگارے بچھ گئے۔ جسے میں نے سوچا' چاہا' پوجا وہ کسی اور کا ہو گیا تھا۔ مجھ پر ایک جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں ساری رات روتی رہی' چیختی رہی۔ امی مجھے سنبھال رہی تھیں' سمجھا رہی تھیں۔ مجھے اس لڑکی سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو حیدر کی منکوحہ تھی۔ میرے خواب اجڑ گئے تھے۔ میں جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔

خالہ کو میری حالت کا پتا چلا تو وہ دوڑی چلی آئیں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس نکاح کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ اہمیت۔ خالو نے جذبات میں آ کر یہ قدم اٹھایا ہے اور مجھے غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ میں سنبھل گئی۔ پھر حیدر کے رویے نے بھی خالہ کی بات پر مہر لگا دی۔ میں مطمئن ہو گئی تھی۔

خالہ نے ہر لمحے مجھے احساس دلایا تھا کہ میں ہی ان کی بہو ہوں۔ میرے لیے یہ اعزاز کسی میڈل سے کم نہیں تھا۔

اذکی کیا تھی حیدر کی نظر میں' خالہ کی نگاہ میں فقط عام سی لڑکی جسے خالو ہمدردی کے تحت لے آئے تھے۔ خالہ نے ہمیشہ اسے کسی تیسرے درجہ کی ملازمہ ہی سمجھا تھا۔ میں نے بھی خالہ کی پیروی کرتے ہوئے اسے ایک نوکرانی کی طرح ٹریٹ کیا۔ لیکن میرے لاشعور میں ہمہ وقت ایک خوف کنڈلی مارے بیٹھا رہتا تھا جو کہ مجھے کبھی بھی مطمئن ہونے نہ دیتا۔ یہ خوف آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگا۔ جب میں نے حیدر کو اذکی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔ اگرچہ وہ اسے بلاتا نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں' میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا تھا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ پھر خالہ کی طرف سے شادی کا اصرار۔ میں نے امی اور ڈیڈی کو اپنی قسم دے کر منا لیا تھا جبکہ ڈیڈی مجھ سے شدید خفا ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک میں غلط تھی میری محبت غلط تھی۔ مجھے ڈیڈی کی اس سوچ سے وحشت ہونے لگی۔ انہیں تو اپنی بیٹی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا کجا کہ ایک ایسی لڑکی جسے انہوں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ اس رات میری ڈیڈی کے ساتھ شدید جھڑپ ہوئی۔

"کیا یہ اس لڑکی پر ظلم نہیں جو کہ حیدر کی منکوحہ ہے۔" ڈیڈی کے الفاظ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"آپ کو میرا احساس نہیں ہے۔" میں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ امی اور ڈیڈی کو آخر ماننا ہی تھا۔

حیدر کی زندگی میں داخل ہو کر بھی میرے اندر سے وہ خوف نہیں نکل سکا مجھے اذکی کے وجود سے نفرت تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب میں نے نئے سرے سے "گیم" پلان کیا۔ ایسا گیم جس میں سارے فائدے میرے ہی تھے۔ خالہ تو ویسے بھی اذکی سے متنفر تھیں۔ ان کی نفرت کو میں نے مزید دوچند کیا تھا ہر وقت اذکی کی برائیاں کر کر کے لیکن جب مجھے اس کی ضرورت

محسوس ہوئی میں نے خالہ کو رام کرنا شروع کردیا۔

پانچ سال گزر جانے کے بعد ڈاکٹر نے جو پروانہ میرے ہاتھ میں پکڑایا تھا اس نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ خالہ کا رویہ بھی بدلنے لگا۔ نندوں نے بھی دبے دبے طعنے دینا شروع کردیے۔ ان سب کی فطرت سے میں واقف تھی۔ اپنا مقام بڑھانے اور حیدر پر احسان کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ میں نے خالہ اور حیدر کو اذکی کی طرف ازخود متوجہ کیا۔ خالہ اذکی سے تو نہیں البتہ مجھ سے اور بھی خوش ہو گئیں۔ پورے خاندان میں واہ واہ ہونے لگی۔ میرے اس عمل سے ڈیڈی بے حد خوش تھے۔ اذکی اور حیدر کے نکاح سے تقریباً" سب ہی لاعلم تھے۔ اسی بات سے فائدہ اٹھا کر میں نے ایک نئی مثال قائم کرکے سب کے دلوں پر راج کرنے کے متعلق سوچا حیدر میری اعلا ظرفی کا قائل ہو گیا۔ اس کی محبت میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔

اذکی ماں بنی تو حیدر بے حد خوش تھا۔ اسے اولاد کی نعمت حاصل ہوئی تھی اسے تو خوش ہونا ہی تھا۔ میں نے بھی خوش دلی کا خول خود پر چڑھالیا۔ زید کو گود میں لیتے ہوئے ایک اور ننھا سا احساس دل میں ابھرا تھا۔ یہ احساس نفرت کا نہیں حسد کا تھا۔ اور یہ حسد مجھے اس مقام تک لے آیا جس میں نری رسوائی ہی رسوائی تھی۔

سوچی سمجھی اسکیم کے تحت میں نے اذکی کو گھر سے نکلوایا تھا۔ مگر یہاں پر مجھے منہ کی کھانی پڑی تھی، میرے وجود کی عمارت دھڑام سے گری تھی۔

"حیدر نے اذکی کو فلیٹ لے دیا۔" میرا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ اس خبر نے مجھے توڑ پھوڑ دیا۔

"تو کیا اذکی، حیدر کے دل تک پہنچ گئی ہے۔" میں خوفزدہ ہو گئی۔ حیدر مجھ سے دور جانے والا تھا۔ چونکہ اذکی کا پلڑا بھاری تھا وہ اس کے بچوں کی ماں تھی۔ مجھے خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ ہمیشہ غیر محسوس طریقے سے اپنی مٹھاس بھری باتوں میں حیدر کو الجھا کر میں نے اذکی سے متنفر کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب ..... سارا پانسا الٹ چکا تھا۔ میں جو جھولی بھر کر لینے کی عادی رہی تھی تہی داماں رہ گئی۔ اس کا سرشار مطمئن چہرہ، سجا سجایا گھر، صحت مند بچے، مکمل گھریلو عورت کا روپ اور پھر بچوں پر فدا ہوتا حیدر۔ سب کچھ اسی کا تھا میرے حصے میں کیا آیا۔

میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا اس کے سکون کو درہم برہم کرنے کا سو میں کامیاب بھی رہی۔

حیدر کے سامنے دو شرائط رکھ کے میں پرسکون ہو چکی تھی۔ حیدر نے دیا کو میرے حوالے کردیا یعنی کہ وہ اذکی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اگر میں ظرف اور دل کو تھوڑا وسیع کرلیتی تو آج خالی دامن نہ رہنا پڑتا مگر میں تو بے حد کم ظرف تھی۔ میں ایسا کیونکر کرتی۔

دیا میرے پاس آئی تو پہلی مرتبہ میں نے اس میں حیدر کی شبیہ ڈھونڈ کر جی بھر کے اسے پیار کیا۔ میری ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے۔ دیا حیدر کی بیٹی تھی میں نے اسے اپنی بیٹی سمجھا مگر وہ اذکی کے وجود کا حصہ بھی تھی وہ مجھے کبھی ماں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ تین سال کی بچی میرے اور اپنے رشتہ کو جان بھی کیسے پاتی۔ ماں سے دوری نے اسے چڑچڑا کردیا تھا۔ وہ دن بھر روتی اور رات بھر چلاتی رہتی۔ میں نے اسے چپ کروانے اور سلانے کا پرانا طریقہ سوچا۔

مجھے جب نیند نہیں آتی تو میں آرام سے دو تین گولیاں کھا کے سو جاتی ہوں۔ میں نے اس تین سالہ بچی کے ساتھ بھی یہی کیا اور وہ ہمیشہ کے لیے سو گئی اور حیدر کی محبت بھی دیا کے ساتھ مر گئی۔ وہ مجھے الزام دیتا ہے کہ میں نے اس کی بیٹی کو قتل کردیا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے اسے مارا ہے لیکن جان بوجھ کر نہیں۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو بس..... بھلا میں حیدر کی بیٹی کو مار سکتی ہوں مگر حیدر کو کون سمجھائے۔

اس نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ حالانکہ اسے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اپنی رسوائی کے ڈر سے خاموش ہو گیا ہے۔

نہ ہی وہ اخبار میں لگنے والی خبروں سے خوفزدہ ہو کر

چپ کی بکل مار بیٹھا ہے۔ اس نے دراصل مجھے ضمیر کے حوالے کردیا ہے تاکہ یہ ضمیر رات دن کچوکے لگائے، کوڑے برسائے، اذیت سے دوچار کرے مجھے۔

خود تو وہ اسی دن چلا گیا تھا اذکی اور زید کو لے کر۔

میں اور میری خالہ اس سنہری محل میں سارا دن چکراتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے کچھ نہیں بولتیں۔ ہمارے پاس بولنے کے لیے بچا ہی کچھ نہیں حیدر چلا گیا۔ میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میں جانتی ہوں اب وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔

بھلا حیدر کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہے۔ مجھے اب جینا چاہیے بھی نہیں میرا زندہ رہنے کو دل بھی نہیں کرتا۔ اب تو دیا بھی رات بھر پکارتی رہتی ہے۔ اسے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے وہ مجھے اپنے پاس بلاتی ہے۔ میں دیا کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں اس تعفن زدہ وجود کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔

کاش میں تم سے معافی مانگ سکتی اذکی! اے کاش نادان انسان سمجھ پائے۔"



بخاری صاحب کا چوکیدار اللہ بخش فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جا رہا تھا جب سامنے گراؤنڈ میں ٹھنڈی گھاس پر پڑے وجود پر اس کی نظر پڑی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باڑھ پھلانگ کر اندر چلا آیا۔ اللہ بخش حیران تھا کہ اتنی صبح ٹھنڈی گھاس پر کون لیٹا ہوا ہے۔ قریب آیا تو آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ وہ کوئی عورت تھی جس کے منہ سے سفید جھاگ نکل کر گردن اور بالوں سے چپک گیا تھا۔ اللہ بخش نے جھک کر اس کا بازو پکڑا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ عورت مر چکی تھی اور اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ کیونکہ اس کا وجود ٹھنڈ سے اکڑ گیا تھا۔

اللہ بخش نے اس کی کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیوں اور بالیوں کو دیکھ کر عورت کی مالی حیثیت کا تعین کیا۔ پھر تھکے تھکے قدموں سے اعلان کروانے کے لیے چل دیا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ پارک سے باہر نکلا تو ایک گھبرائی گھبرائی سی بوڑھی عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

اللہ بخش نے اسے آواز دی۔ وہ راحت تھیں جو کہ ساحرہ کو اس کے کمرے میں نہ پا کر گھبراتے ہوئے باہر نکل آئی تھیں۔ اور جب گیٹ کھلا دیکھا تو ان کا کلیجہ حلق میں آ گیا۔

اللہ بخش نے انہیں پارک میں پڑی اس مردہ عورت کے متعلق بتایا۔ راحت کی آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ گم صم سی اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔

آج وہ پورے آٹھ برس بعد اس سرزمین پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اذکی تھی جو کہ چار سالہ دیا پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ دیا اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت سموئے اردگرد کے مناظر کو انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جبکہ زید قدرے بیزار سا تھا۔ کیونکہ اس کی نیند ادھوری رہ گئی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعے وہ گھر پہنچے تھے۔ اپنے آنے کی اطلاع اس نے بہنوں کو نہیں دی تھی اسی لیے راحت ولا میں سناٹوں نے استقبال کیا۔ اس نے پھاٹک کھولا اور اندر چلا آیا۔ دھول مٹی اور جگہ جگہ گند بکھرا ہوا تھا۔ دیا نے لان میں موجود جھولے کو دیکھ کر شور مچانا شروع کردیا۔ زید اور دیا دونوں بھاگتے ہوئے جھولے تک گئے اور پھر دونوں میں زوردار قسم کی جھڑپ ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی اذکی نے دونوں کی صلاح کروائی۔

"بیٹا! آپ بعد میں لے لینا۔ پہلے چھوٹی بہنا کو جھولا لینے دو۔" وہ منہ بناتا ہوا دیا کو جھولے پر بٹھانے لگا۔ دیا خوب چہک رہی تھی، اس کی معصوم چہکار نے برسوں کی چھائی خاموشی کو توڑ ڈالا۔ سکوت ٹوٹ چکا تھا۔ سناٹا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

اس کے جانے کے چھ ماہ بعد امی نے ساحرہ کی خودکشی کی اطلاع دی تھی۔ اس نے بے دلی سے سن کر فون رکھ دیا۔ وہ سب کچھ بھلا سکتا تھا مگر اپنی بیٹی کی قاتلہ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یہی بہتر لگا تھا کہ وہ منظر سے ہٹ جائے۔ اسی لیے وہ اذکی کو لیے جدہ چلا گیا۔ دو سال پہلے راحت بھی اس جہان فانی سے کوچ

کر گئی تھیں۔ ساحرہ کے مرنے کے بعد ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ سارا سارا دن بولائی بولائی حیدر کو پکارتی رہتیں۔ بیٹیاں روزانہ تو نہیں ہفتہ بعد آجاتی تھیں۔ پاگل ماں کی خیریت دریافت کرنے۔

"حیدر۔" اذکی نے اسے پکارا تھا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ تیزی سے اذکی کی طرف بڑھا تھا جو کہ بیگ پکڑے دروازہ کھلنے کی منتظر کھڑی تھی۔

اذکی نے اندر آکر کھڑکیاں دروازے کھولے۔ تازہ ہوا کمروں میں داخل ہوئی تو حبس کچھ کم ہوا۔ اب وہ دوپٹا اتارے، پائپ پکڑے صحن اور برآمدہ دھو رہی تھی۔ دونوں بچے پانی کو دیکھ کر اچھلنے کودنے لگے۔

"اذکی! میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ اتنے میں تم یہ کھٹ راگ ختم کرو۔" وہ پانی کی بوتل پکڑے اس کے قریب چلا آیا۔ اذکی نے حیدر کے مرجھائے وجود کو بغور دیکھا۔ وہ پہلے سے کس قدر بدل چکا تھا نہ مزاج میں تندی رہی تھی نہ ہی بے حسی اور لاپروائی۔ وہ بے حد ذمہ دار اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"کپڑے تو بدل لیں۔" اذکی اس کے پرشکن لباس کو دیکھ کر بولی۔

"ٹھیک ہی ہیں۔ میں کون سا ولیمہ اٹینڈ کرنے جارہا ہوں۔" وہ بے نیازی سے کہتا ہوا دیا کو آواز دینے لگا۔ وہ بھی باپ کو باہر کی طرف جاتا دیکھ کر لپکتی ہوئی آگئی تھی۔ حیدر نے جھک کر اسے اٹھایا اور پورچ کی طرف آگیا۔

"بابا آپ کی گاڑی تیسری نسل کے بھی کام آئے گی یقیناً"... وہ گاڑی کا آئل پانی چیک کرکے آہستگی سے بڑبڑایا۔

اپنی گلیاں، پرانے راستے سب اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ کھانا پیک کروا کے اس نے دیا کو آئسکریم کھلائی۔ سپر مارکیٹ سے جیلی، کینڈیز اور چاکلیٹ کی شاپنگ کرکے وہ بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔

واپسی پر اپنے علاقے کے قبرستان پر نظر پڑی تو گاڑی کو روڈ پر کھڑا کرکے نیچے اتر آیا تھا۔

"بابا کدھر جارہے ہیں۔" دیا اس کی انگلی پکڑے حیرانگی سے بولی۔

"دادو سے ملنے۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

"کس سے۔" دیا کو شاید سمجھ نہیں آئی تھی۔ ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کرکے وہ اشتیاق سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ ماں کی قبر کے پاس آکر دو زانو بیٹھ گیا تھا۔ دیا نے بھی اس کی پیروی کی۔

نجانے کون کون سے منظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ اس نے فاتحہ پڑھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ بہت سی نمی نے انگلیوں کی پوروں کو چھوا تھا۔ ساتھ بنی قدرے اونچی سی قبر کے سنگ مرمر کے کتبہ پر لکھا ساحرہ کا نام پڑھ کے اس کا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دفعہ پھر سے گیلا ہونے لگا۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وجود کپکپانے لگا تھا۔ دیا نے بھی باپ کو دیکھ کر ننھے منے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔

"میں تم سے نفرت کرنا چاہتا ہوں مگر......" اس کی قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"مگر میں ایسا کر نہیں سکتا۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بہت زیادہ۔" شرٹ کی آستین سے چہرہ صاف کرکے وہ بڑبڑایا۔

"پپا! چلیں بھی۔" دیا گھبرا گئی تھی۔

"چلتے ہیں بیٹا۔" وہ اٹھ کر بابا کے قریب آگیا اور پھر دیا کی تربت کو دیکھ کر وہ بے تحاشا رونے لگا تھا۔

"میری پیاری بیٹی۔" اس نے تھوڑی سی پرنم مٹی کو اٹھا کر چوما۔

"یہ میرا خاندان ہے۔ انتہا پسند اور خود پرست، محبتوں میں بھی اور نفرتوں میں بھی۔" اس نے اذیت سے سوچا۔

"یا اللہ میں بڑا بے انصاف رہا ہوں، مجھے معاف کر دینا۔" اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور پھر سہمی ہوئی بچی کو ساتھ لپٹا لیا۔ دیا رونے لگی تھی پھر ننھا سا ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ کر دھیرے سے بولی۔

"گھر چلیں۔"

"ہاں چلو۔" وہ اٹھا اور پھر تیز قدموں سے پھاٹک

عبور کر گیا۔ گھر آنے تک اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ لیکن اذکی پہلی نظر میں ہی اسے دیکھ کر جان گئی تھی اور پھر دیا نے بھی تصدیق کر دی۔

"حیدر! کھانا کھا لیں۔" اذکی نے پلیٹیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے حیدر کو آواز دی۔ وہ بے دلی سے محض ان کا ساتھ دینے کے لیے چلا آیا تھا۔ پھر جلدی اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اذکی وجہ جانتی تھی اسی لیے خاموش رہی۔ گزرے برسوں میں وہ حیدر کے بے حد قریب آگئی تھی۔ بن کہے ہی جاننے لگی تھی کہ حیدر کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور فی الحال وہ تنہائی اور خاموشی چاہتا تھا لہٰذا اذکی بچوں کے ساتھ مصروف رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صرف لمحاتی کیفیت ہے کچھ دیر بعد وہ ان کے درمیان ہوگا اور ہوا بھی ایسے ہی۔ دو گھنٹے بعد جب وہ باہر آیا تو پہلے کی طرح فریش تھا۔ اس کا ارادہ بچوں کو گھمانے پھرانے کا تھا لہٰذا مری کا پروگرام بن گیا۔ بچوں نے سنا تو خوشی سے اچھلنے لگے۔ اذکی نے مختصر سی تیاری کی۔ حیدر جلدی کی گردان کیے جارہا تھا۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ بس یہ عادت شاید بہت پختہ ہو چکی تھی۔ اذکی ہمیشہ کی طرح بوکھلانے لگی۔

حیدر پہلے کی طرح آرڈر دینے کی بجائے اس کے ساتھ مل کر پیکنگ کروا رہا تھا۔ پھر اس نے گاڑی میں سامان رکھا۔ اذکی نے کمروں کو لاک کیا اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔ سفر کے دوران بچوں نے خوب اودھم مچائے رکھا۔

آسمان پر چھائے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر دیا بے خود ہونے لگی تھی۔

"بھائی بادل۔" وہ خوشی سے چہکی اور پھر شفاف روڈ پر دوڑنے لگی تھی۔

"دیا گر جاؤ گی۔" زید بھی اس کے پیچھے لپکا۔ حیدر نے بھی زید کی پیروی کی۔ اذکی سست رفتاری سے چلنے لگی تھی۔

جنون کسی بھی شکل میں ہو۔ اندھی کھائی کی طرف لے جاتا ہے۔ بہت سال پہلے اس نے سوچا تھا کہ زندگی میں سوائے اندھیروں کے کچھ نہیں۔ آج وہ وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔

راحت اور ساحرہ کی نفرت نے اسے یہی باور کروایا تھا کہ وہ کبھی کسی مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے کبھی نہیں آسکتی۔

وہ دونوں عورتیں محبت میں بھی جنونی تھیں اور نفرت میں بھی۔ ان دونوں کی مشترکہ محبت بھی جنون خیز تھی اور وہ محبت حیدر سے تھی۔ ایک بیوی کی حیثیت سے اسے چاہتی تھی اور دوسری ماں کی حیثیت سے۔ ان کی مشترکہ نفرت بھی اندھی تھی اور وہ تھی اذکی سے۔

ان دونوں عورتوں نے کبھی نہیں یہ سوچا تھا کہ یہ تیسری عورت بھی سینے میں ویسا ہی جذبہ رکھتی ہے۔ اس کی دھڑکن بھی اس شخص کو پکارتی ہے جس کی محبت میں وہ دونوں گرفتار ہیں۔

وہ دونوں باحیثیت اعلا خاندانی عورتیں بے صبر اور جلد باز تھیں۔ سو اس کا نتیجہ پچھتاوے کی شکل میں ان کے سامنے آیا۔ جب کہ اس عورت نے ہمیشہ ہر حال میں صبر کیا۔ اور اسے وہ سب بھی ملا جو اس نے کبھی چاہا تھا اور وہ بھی جس کی طلب اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

"اور میرے صبر نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔" اس نے طمانیت سے سوچا اور حیدر کے ہم قدم ہو گئی۔

"ماڈل ۱۹۹۰ء۔" مال روڈ پر چلتے ہوئے تین منچلوں نے مبالغہ آمیزی کی حد کرتے ہوئے فقرہ کسا تھا۔ اذکی اور حیدر نے بے اختیار ان تینوں کی طرف دیکھا تھا۔ جو کہ گاڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیر لب مسکرا رہے تھے۔ اذکی اور حیدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

☼ ☼